سائی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
گلزار کی تخلیقی صنف
تروینی
تشریح و تجزیہ
ڈاکٹر سید تقی عابدی

گلزآر کی تخلیقی صنف

تروینی

تجزیہ اور تشریح

ڈاکٹر سید تقی عابدی

کتاب : گلزار کی تخلیقی صنف تروینی (تجزیہ وتشریح)

مصنف : ڈاکٹر سید تقی عابدی

باہتمام : عبدالصمد دہلوی

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : **ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز**

10 میٹروپول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Gulzar ki Takhliqi Sinf—Triveni

Written & Compiled by

Dr. Syed Taqi Abidi

ISBN: 978-93-83327-87-4

First Edition :2019

Price: **₹ 200/-**

Library Edition: ₹ 395/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910, 8368305471 (Whatsapp)

E-mail: abdus26@hotmail.com

فہرست

☆☆☆

رو میں ہے رخشِ عمر

نام : سیّد تقی حسن عابدی

ادبی نام : تقی عابدی

تخلص : تقی

والد کا نام : سیّد سبط نبی عابدی (مرحوم)

والدہ کا نام : سنجیدہ بیگم (مرحومہ)

تاریخ پیدائش : یکم مارچ 1952

مقام پیدائش : دہلی۔انڈیا

تعلیم : ایم بی بی ایس (حیدر آباد،انڈیا)—ایم ایس (برطانیہ)

: ایف سی اے پی (امریکہ)—ایف آر سی پی (کنیڈا)

پیشہ : طبابت

ذوق : شاعری،ادبی تحقیق وتنقید

شریکِ حیات : گیتی

اولاد : دو بیٹیاں (معصوما اور رویا)
دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)

تصانیف : (61) شہید، (1982) جوشِ مودّت، گلشنِ رویا، اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔء، رموز شاعری، اظہارِ حق، مجتہد نظم مرزا دبیرؔ، طالع مہر، سلکِ سلام دبیر، تجزیہ یادگار انیسؔ، ابواب المصائب، ذکر دُرباران، عروسِ سخن، مصحف فارسی دبیر، مثنویات دبیر، کائنات نجم، روپ کنور کماری، دُربار رسالتؐ، فکر مطمئنہ، خوشۂ انجم، دُرِ دریائے نجف، تاثیر ماتم، نجمی مایا، روشِ انقلاب، مصحفِ تغزل، ھوا لنجم، تعشقؔ لکھنوی، ادبی معجزہ، غالبؔ دیوان نعت ومنقبت، چوں مرگ آید، رباعیات دبیرؔ، سبد سخن، دیوان غالبؔ فارسی، فیضؔ فہمی، مطالعہ دبیر کی روایت، اردو کی دو شاہکار نظمیں، رباعیات رشیدؔ لکھنوی، رباعیات انیسؔ، فیضؔ شناسی، حالیؔ فہمی، مسدس حالیؔ، کلیات حالیؔ، رباعیات حالیؔ، بچوں کے حالیؔ، حالیؔ کی نعتیہ شاعری، حالیؔ کی نظمیں، قطعات حالیؔ، حالیؔ کے قصیدے اور حالیؔ کے شخصی مرثیے، کلام وسلام انیسؔ، کلیات سعید شہیدیؔ، ترویِنی۔

زیرِ تالیف : تجزیۂ شکوہ جواب شکوہ، فانیؔ لا فانیؔ، تجزیہ رباعیات فراقؔ گورکھپوری، اقبالؔ کے چار مصرعے، رباعیات بیدلؔ، باقیاتِ فیضؔ۔

☆☆☆

زندگی نامہ

نام : سمپورن سنگھ کالرا

تخلص : گلزار

شہرت : گلزار (فلم ساز اور شاعر)

خطاب : پدم بھوشن 2004ء

پیدائش : 18/ اگست 1934

مقام : دینہ (جہلم ضلع، پنجاب) (برٹش انڈیا)

والد : ماکھن سنگھ کالرا

والدہ : سجان کور

بیوی : راکھی (فلم اسٹار) شادی (1973)

اولاد : ایک بیٹی میگھنا گلزار

تعلیم و تربیت : کالج تک علم و ادب میں اور بمل رائے کی تربیت فلمی دنیا میں۔

آغاز شاعری : ایک بوند چاند (مجموعۂ کلام)، جانم (مجموعۂ کلام) اور فلمی گیتوں کے ساتھ۔

مشاغل : شاعر، افسانہ اور کہانی نویس، گیت اور مکالمے کار، اسکرپٹ رائٹر، ہدایت کار، فلم ساز، مصور، ادیب، چانسلر آسام یونیورسٹی۔

سکونت : دینہ، دہلی اور ممبئی۔

مسافرت : دنیا کے مشہور شہروں میں کاروباری، ادبی اور تفریحی کاموں میں جا چکے ہیں۔

پڑھت : نرم لہجے میں متانت کے ساتھ تحت اللفظ کو سحر بیان کر دیتے ہیں۔

اخلاق و کردار : من موہنی، عجز و انکساری، دل ربائی اور مسکراہٹ کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

تصانیف

ا : چاند پکھراج کا (شعری مجموعہ) (نظمیں۔ غزلیں۔ ترائیلے اور تروینی) مطبوعہ روپا اینڈ کمپنی۔ دہلی ۱۹۹۵ء

ب : رات پشمینے کی۔ (شعری مجموعہ) (نظمیں۔ غزلیں۔ تروینی) مطبوعہ، روپا اینڈ کو۔ دہلی۔ ۲۰۰۲ء

ج : پندرہ پانچ پچھتّر (شعری مجموعہ)، (نظمیں) مطبوعہ، پاکیزہ آفسیٹ۔ پٹنہ، ۲۰۱۰ء

د : پلوٹو۔ (شعری مجموعہ)، (نظمیں)

ھ : کچھ تو کہیے (شعری مجموعہ)، (نظمیں، تروینی)،

و : بال و پر سارے (کلیات شعری) نظمیں، غزلیں، ترائیلے، ماہیے،

ترِوینیاں) مطبوعہ۔ سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۷ء

ز : دھواں (افسانوں کا مجموعہ)

ح : ڈیوڑھی، (افسانوں کا مجموعہ)

ط : دولوگ (ناول)

ی : چورس رات۔

ک : ترِوینی (شعری مجموعہ)، (ترِوینیاں)

ل : پچھلے پنے۔

م : منظر نامہ۔

ن : مرزا غالب۔ (غالب کا ایک سوانحی منظر نامہ ہے)

- گلزار نے پچاس سے زیادہ فلموں کی کہانیاں لکھی ہیں۔
- گلزار نے ڈیڑھ درجن سے زیادہ فلموں کی ہدایت کاری کی ہے۔
- گلزار نے دو ٹی وی سیریل دوردرشن کے لیے بنائے۔ کردار اور مرزا غالب۔ تحریر پریم چند کی (گئودان، نرملا اور دس افسانے)
- گلزار نے امجد علی خاں اور پنڈت بھیم سین جوشی پر دستاویزی فلمیں بنائی۔
- گلزار نے دس سے زیادہ میوزک البم بنائے جو غیر فلمی تھے۔
- گلزار نے پچاس سے زیادہ فلموں کے گیت لکھے جنھیں بڑے بڑے گلوکاروں نے گایا ہے۔
- گلزار نے پچاس سے زیادہ فلموں کے مکالمے رقم کیے۔
- گلزار نے پچاس سے زیادہ اسکرین پلے لکھے۔

فتوحات اوراعزازات

- پدم بھوشن صدارتی ایوارڈ۔۲۰۰۴ء
- ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ۔افسانہ مجموعہ ''دھواں'' ۲۰۰۳ء
- گنگادھر پٹیل ایوارڈ۔سمبل پور یونیورسٹی۔۲۰۰۶ء
- اعزازی فیلوشپ تاحیات۔انڈین انسٹی ٹیوٹ ۲۰۰۱ء
- داداصاحب پھالکے ایوارڈ۔۲۰۱۳ء
- گلزار کودس سے زیادہ بہترین گیت کار ایوارڈ دیے گئے۔
- گلزار کو چار سے زیادہ بہترین مکالمے کار ایوارڈ دیے گئے۔
- گلزار کو چار سے زیادہ بہترین ڈاکومنٹری ایوارڈ دیے گئے۔
- گلزار کو کئی بہترین ہدایت کار، بہترین اسکرین پلے، اور بہترین تفریحی فلم ایوارڈ دیے گئے۔

انٹرنیشنل ایوارڈ

- 2009: Oscar Academy Award for Best Original Song- Jai Ho/ Slumdog Millionaire.
- 2009:Grammy Award for Best song wirtten for Motion Pictures, Television or other visual media- 2010- Jio Ho/ Slumdog Millionaire-

گلزار اکیسویں صدی کے شاعر کیوں ہیں؟

نکلسن کہتا ہے اچھا اور عمدہ شاعر اپنے دور میں محدود نہیں رہتا وہ روایت سے ماضی میں جُڑا رہتا ہے اور آیندہ آنے والے دور کا پیغام رساں بھی ہوتا ہے۔ بعض شعرا اور ناقدوں نے جن میں احمد ندیم قاسمی اور گوپی چند نارنگ بھی شامل ہیں گلزار کو اکیسویں صدی کا شاعر قرار دیا ہے۔ یہ سچ ہے ہر دور کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے کیوں کہ ہر دور کا ماحول اور فرد جدا ہوتا ہے۔ ماحول زمان اور مکان کی اشتراکیت سے بنتا اور افراد کی تہذیب و تربیت کا جزو لازم ہوتا ہے جس کا اظہار ہر دور کی شاعری کی شناخت ہوتا ہے۔

ہم یہاں گلزار جیسی ہمہ جہت شخصیت کی ایک اہم اور معتبر شناخت صرف شاعری پر گفتگو کریں گے جو ہماری اور شاید خود گلزار کی نظر میں ان کی دائمی اور جاویدانہ پہچان ہے۔ اگر چہ ہر تخلیقِ فن میں وہبی اور اکتسابی عناصر شامل ہیں لیکن فطری شاعری ہی وہ تاج ہے جو قدرت کی جانب سے شاعر کے سر پر ہمیشہ کے لیے باقی رہتا ہے۔

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایں سعادت بزور بازو نیست

یوں تو گلزار ایک اچھے افسانہ نگار، کہانی نویس، مکالمہ نگار، اسکرپٹ رائٹر، مصور، گیت کار، ہدایت کار، فلم ساز اور محنتی ہنرمند ہیں جن کی شخصیت میں عجز و انکساری کے ساتھ برصغیر کا تہذیبی نبھاؤ اور تربیتی سلیقہ موجود ہے لیکن جو خصوصیت انھیں ان تمام ہنری قدروں سے اونچا بناتی ہے وہ ان کی انسانیت، انسان دوستی ہے جو ایک بڑے انسان کی سب سے بڑی شناخت ہے۔

گلزار اکیسویں صدی اور اس گلوبل ولیج کے ممتاز شاعر اس لیے بھی ہیں کہ

ف ا گلزار کی شاعری روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک پُل کی طرح ہے یعنی دونوں سے جڑی ہوئی ہے جو آج کے دور میں اردو شاعری کے بقا اور ارتقا کے لیے لازم ہے۔

ف۲: گلزار کی شاعری کے مضامین دنیائے اردو ادب میں ہر طبقے کے، ہر عمر کے، ہر فکر و فہم کے لوگوں کو متاثر کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اسی لیے ہم گلزار کی ترقی پسند فکر کو ترقی پسند گروہی قبیلہ میں شامل نہیں کر سکتے۔ یہاں جوان ہو کہ بوڑھے، کسان ہو کہ افسران، غریب ہو کہ امیر، عامی ہو کہ عالم، دیہاتی ہو کہ شہری سب ان کی شاعری سے اس لیے بھی مستفید ہیں کہ ان کی شاعری معاشرے کے حقیقی مسائل کو سلیس اور سادے طور پر بلا جھجک پیش کر دیتی ہے۔ شاعری کو حق گفتاری صدیوں کی زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔ اس لیے وقتی بناوٹی جھوٹے قصیدوں کے اشعار ممدوح یا شاعر کے مرنے کے ساتھ کتابوں کی قبروں میں تلف ہو جاتے ہیں۔

ف۳: گلزار نے اپنی شاعری کے لیے آج کی رائج الوقت سیدھی سادی زبان

استعمال کی ہے جس میں سلاست، سادگی، شیرینی اور روانی ہے کیونکہ وہ فقروں، مصرعوں میں الفاظ کے انتخاب کے دھنی اور ماہر ہیں وہ الفاظ کی اندرونی غنائیت جس کو Organic rhythm کہتے ہیں مصرعے کے دوسرے الفاظ کی نغمگی سے جوڑ کر مصرعہ کو رواں دواں اور ترنم خیز کر دیتے ہیں۔ ہماری کلاسیک شاعری میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں جن میں ایک طرف سنسکرت اور پراکرت، دوسری طرف عربی و فارسی اور تیسری طرف انگریزی اور یوروپی زبان کے الفاظ، آج کے دور میں عربی فارسی کے الفاظ کم ہوگئے ہیں جن کی جگہ دوسری زبانوں خصوصی طور پر ہندی اور انگریزی کے الفاظ نے لے لی ہے۔اسی لیے آج کی موجودہ شاعری میں ان تازہ الفاظ کا رنگ اور ان کی خوشبو احساسات کو مہمیز کر دیتی ہیں۔گلزار کی شاعری میں موجودہ دور کی شگفتہ عام فہم زبان اور عوامی لہجہ، ان کی شعریت کو موجودہ نسل سے جوڑ دیتی ہے اور آج جب اردو کانوں کی زبان بن چکی ہے اور نوجوان نسل رسم الخط سے واقف نہیں۔گلزار کی شاعری کو دیوناگری، اور رومن اسکرپٹ میں آسانی کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے جس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور امید ہے کہ اکیسویں صدی کی نسلیں اور گلوبل ویلیج کی قومیں گلزار کی شاعری سے زیادہ فیض یاب ہوتی رہے گی۔

ف۴: گلزار کی شاعری آج کے دور کی قدروں سے جڑی ہوئی ہے۔ یہاں ادب برائے ادب اور ادب برائے ہدف دونوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔رومانی نظمیں، جذباتی اور احساساتی قدریں اور پھر سماجی ، اخلاقی، ثقافتی اور وطنی

کاوشیں ان کے کلام میں قدم قدم پر چراغ راہ کے مانند بصارت رکھنے والوں کو بصیرت کی روشنی فراہم کررہی ہیں۔ اکیسویں صدی احترام انسان، مقام انسان، حقوق انسان کی وکالت کرے گی اور یقیناً گلزار کے بہت سے اشعار اس انسانیت کی عدالت میں گواہی دینے کے لیے پیش ہوں گے۔

ف۵: اکیسویں صدی کی نسل سائنس کا دودھ پی کر توانا اور سیانا ہوئی ہے۔آج کا نوجوان دنیا کو سائنس کی نظر سے دیکھتا، سائنس کی فکر سے سوچتا، اور سائنس کے ہاتھوں سے ٹٹولتا ہے، سائنس کے رنگوں سے وہ اپنی ذہنی دھنک بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ آج کی شاعری کے دسترخوان پر سائنس کے ذائقہ کا چٹخارہ ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ صدیوں بعض قوموں نے بغیر مرچ نمک کے بھی گزارا کیا ہے لیکن جب منہ کو مزا لگ جائے تو پھر چھٹکارا مشکل ہے۔گلزار ان انگشت شمار اردو کے شاعروں میں ہیں جس نے اپنی شاعری کو جہاں کہیں بھی موقع اور محل پایا، ان سائنسی مطالب اور وسائل سے جوڑا۔ یہاں تک کہ اپنے ایک مجموعۂ کلام کا نام نظام شمسی کے عاق شدہ سیارہ ''پلوٹو'' پر رکھا۔اس طرح کا adaptation ہمیں اردو شعروادب میں بہت ہی کم نظر نہیں آتا ہے۔ سائنسی تجربات ہو کہ کہکشاں کے انکشافات، سیاہ بھنور (Black hole) ہو کہ مارز اور جوپیٹر کا گزر، چاند سورج کا سفر ہو کہ گیراویٹی کا اثر سب کچھ گلزار کے صحیفہ شاعری میں اُسی طرح سے ابھرتے ہیں جس طرح تصوفی اصطلاحات قدیم کلاسیک شعروں میں۔ یہ تمام مطالب گلزار کی شاعری کی آکسیجن ہیں جو ان کی شاعری کو آیندہ بہت گہری اور بہت بلند منزلوں پر زندہ رکھیں گے۔

ف۶: یہ سچ ہے کہ سچی، اچھی، احساسی اور جذباتی شاعری جس کی عمدہ مثالیں گلزار کی اقلیم سخن میں موجود ہیں، نسیم سحر اور شبنم کی طرح کلیوں کو مسکرانے یا پھولوں کو رولانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ جس طرح نسیم سحر اور شبنم کو ملکوں کی سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا اُسی طرح شاعری کو بھی ایک ملک کی مِلک نہیں کہا جاسکتا اسی لیے دنیہ کے اس دردمند شاعر کی شاعری سے دنیا کے تمام اردو پرستاران فکر کا درمان اور دلی درد لیتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ شاعری کے گھنے درخت کا سایہ سرحد کے دونوں طرف نہیں! آج دنیا میں اردو کی آٹھ سے زیادہ نئی بستیاں موجود ہیں ان تمام بستیوں کے باسیوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے مشاعروں میں گلزار کو دیکھا اور ان کی شاعری کو سُنا اور اپنے محسوسات میں محفوظ کیا تا کہ محظوظ ہوتے رہیں۔

ف۷: گلزار کی شاعری اس لیے بھی جاندار اور پائیدار ہے کہ اس کے گلشن شاعری میں کئی قسم کی گل طرازی ہے۔ خیالات کی خوشبو ایک طرف، بیان کا رنگ روپ دوسری طرف اور منظوم کلام کی ہیئت یعنی شکل وصورت جس میں کہیں قطعات، کہیں ترائیلے، کہیں ماہیے، کہیں گیت، کہیں تروینی، کچھ غزلیں اور اغلب نظمیں اس باغ کی سیر کرنے والوں کو اپنے اپنے ذوق نظر اور ذائقہ ذہن کا گلدستہ پیش کرتی ہیں اس طرح یہاں شاعری کا کینوس وسیع ہونے کے ساتھ تہہ داری، گیرائی اور گہرائی کی وجہ سے بلندی کا حامل ہے۔ یہ کلام کی بلندی اور وسعت، زمانے کے چھوٹے، موٹے ادبی سیلابوں سے کلام کی حفاظت کی ضمانت دے رہی ہے۔ کلاسیک شاعری کا صحن سکڑتا جارہا ہے اور جدید شاعری بخصوص

نظموں کا چمن پھیل رہا ہے۔گلزار کا کلام زمان اور مکان کی نسبت سے موزوں ہے کیوں کہ ان کی انگلیاں نہ صرف قلم پکڑتی ہیں بلکہ اردو شاعری کی نبض کو بھی پرکھتی ہیں تا کہ امیج کی خیالی تصویر کو جب صفحۂ قرطاس پر نازل کیا جائے تو وقت پروف رنگوں میں اس کو سجایا جائے اور پھر یہ دائمی رنگ اجنٹا ایلورا کی طرح صدیوں کتابوں میں رنگ اور روپ بکھیرتے رہیں۔

ف۸: ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور احساس ایجاد کا باپ۔ احساس اور ضرورت کے ملاپ سے چیز کا وجود قائم و دائم ہے۔ اکیسویں صدی کلاسیک لٹریچر کی صدی نہیں پھر بھی جدید زیورات کے جھنڈ میں حسینہ کا کان کا کلاسیک آویزہ نظر کو کھینچ لیتا ہے۔ اسی طرح غزل، نظم، مثنوی، قطعہ، رباعی، قصیدہ، مرثیہ، گیت، ماہیے، دوہے کے ہوتے ہوئے بھی بعض شاعروں نے کچھ تصرف اور کچھ نئے تجربات سے کچھ اختراع کیا جن کی تعداد بہت کم ہے۔گلزار نے بھی تقریباً چار دہائیوں قبل ایک نئی صنف ''تروینی'' اردو شاعری کو دی ہے۔ اس صنف میں فنی سہولتوں کی وجہ سے موجودہ دور کے شاعروں کو بیشتر شاعری کے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں اور اس مشق سخن سے موضوع اور مطلب کو طویل نظموں میں کہنے کے بجائے تین مصرعوں میں کہنے کی ریاضت بھی ہو جاتی ہے۔شاید آیندہ دور کم اشعار میں زیادہ بیان کا دور رہے اور اس طرح گلزار کی راہ نمائی نوید صبح صادق ثابت ہوگی۔

ف۹: ''چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد'' گلزار ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کا ہر وہ لفظ جس کا انھوں نے ارادہ کیا زیور طبع سے

آراستہ ہوگیا۔سلولائیڈ کی بات ہم نہیں کرر ہے ہیں وہ تو اپنی جگہ محفوظ ہے یہاں تمام نثری اور منظوم کلام سے مراد ہے جس سے عوام اور خواص، اردو اور غیر اردو افراد، جوان و پیر، عامی و عالم، دیسی اور پردیسی، مردوزن سب مستفید ہیں کیوں کہ گلزار کئی بار چھپ چکا ہے اور کتب خانوں میں موجود ہے۔مختلف انجمنوں، سوشل میڈیا گروہوں نے کمپیوٹر کے پردوں پر بھی اسے پیش کیا ہے اور کاسٹوں میں بھی بند کیا ہے۔موجودہ دور اور آنے والے وقتوں میں گلزار کے کلام تک رسائی مشکل نہیں۔

ف۱۰: اردو شعروادب میں سب سے زیادہ گائے جانے والا شاعر فیض احمد فیضؔ ہے۔فیض کی ہمہ گیر شہرت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ان کی غنائی شاعری کو اچھے گانے والے بڑی تعداد میں ملے۔گلزار بھی فلموں کے گیت اور دستاویزی فلموں کے علاوہ کئی ممتاز موسیقار جیسے استاد امجد علی خاں، لتا منگیشکر، اشوک کمار، جگجیت سنگھ، غلام علی، عابدہ پروین، آشا بھونسلے وغیرہ وغیرہ سے گائے گئے ہیں۔جن کے نمونے آج بھی اور کل بھی انگلیوں کے اشارے پر دستیاب ہوں گے۔ جدید دور میں کتاب کی ریڈرشپ کم اور ڈیجیٹل ٹکنالوجی سے پڑھنے کا کام زیادہ ہوگا اسی لیے اردو کے کتب خانے اب ڈیجیٹل بنک میں لاکھوں کروڑوں صفحات جمع کر چکے ہیں جو کئی طریقوں سے پڑھنے والوں کو حاصل ہوسکتے ہیں۔انگریزی کا محاورہ World is not fair بتا رہا ہے کہ ہر ایک پر ہر طرح سے فطرت مہربان نہیں رہتی، کتنے زرخیز زمین میں دبے ہوئے بیج پتھر کے نیچے کبھی درخت نہیں بنتے، کتنے عمدہ شاعروں کے دیوان

آج ہمارے درمیان نہیں۔ مشہور ہے کہ شہرت، دولت، اچھی اولاد، عزت اور صحت ایک جگہ مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ گلزار خوش نصیب ہیں کہ ان کو قدرت نے دل کھول کر نوازا ہے۔

ف ۱۱: گلزار کو اردو شعر و ادب اور اس سے وابستہ افراد سے والہانہ محبت ہے جس کو آپ ان کی شاعری کی ساحری میں دیکھ سکتے ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں اردو ترقی بورڈ بنا، اب اردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہے اردو کو اس عالمی زبانوں کے پُر آشوب ماحول میں پنپنے کے لیے کئی اقدامات کی ضرورت ہے جن کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں، مگر ایک اہم کام جو اردو کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑ کر اسے دور دراز مقامات تک پہنچانا اور اس کی تشہیر اور تحفظ کرنا ہے اس میں گلزار صاحب نے جو خدمات انجام دیے ہیں اس دور میں بہت کم افراد کر پائے۔ مرزا غالبؔ پر ٹی وی سیریل اور میوزک البم، گیتوں اور غزلوں کے غیر فلمی میوزک البم اور مکالمے، کئی دستاویزی فلمیں اور مختلف اسکرین پلے سب کچھ موجودہ دور میں اردو شعر و ادب کی خدمت ہے اور یہی اردو زبان کی عصر حاضر میں ضرورت بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کام اس میدان میں اردو کے اس سپاہی نے تن و تنہا کیا وہ پورا اردو لشکر مل کر بھی نہ شاید کر سکا۔

ف ۱۲: اردو غزل کے ممتاز اور بڑے شاعر فراقؔ گورکھ پوری نے اپنے مقالے ''اردو کی عشقیہ شاعری'' میں تقریباً ستّر (۷۰) سال پہلے اردو کے شاعروں اور تخلیق کاروں کو نصیحت کی تھی کہ ہندی کے آسان شیرین رسیلے الفاظ اور برصغیر کی تلمیحات اور اصطلاحات کو اپنے فن میں برتو تا کہ شاعری کی جڑیں

اردو کی جنم بھومی میں گڑی رہیں اور آیندہ ہونے والے ادبی جھونکوں سے نہال اردو محفوظ رہے۔ ہمارے تخلیق کاروں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ کی لیکن بعض شعرا جن میں گلزار سرِ فہرست ہیں اس اہم نکتہ سے فائدہ اٹھایا جس کی وجہ سے اب ان کی شاعری کو خطرہ نہیں۔ اب ان کی شاعری کے لیے ارسال اور ترسیل کا اہم اور مشکل مسئلہ آسان ہو چکا ہے۔ گلزار کی کوئی بھی شعری تخلیق مقامی رنگ و بو کے بغیر نظر نہیں آتی۔ اس عمل کے لسانی تجربے دوسرے شاعروں کے لیے تقلید کے قابل ہیں۔

یہاں آخر میں یہی کہوں گا کہ یہ گلزار کی شاعری ہی ہوگی جس سے انھیں شاید صدیوں کی زندگی ملے، ان کے نثری تخلیقات کی عمر شاعری کی عمر سے بہت کم ہوگی کیونکہ ماحول کے ساتھ آہستہ آہستہ کردار بھی بدلنے لگتے ہیں اور یہ تحریریں ذہنی صفحات پر کم رنگ، دھندلی اور بے اثر ہو جائیں گی۔ رہا ان کی فلموں سے ان کا تعرف یہ سیلولائڈ کی چمک دمک نصف صدی کے آر پار وقت کی دیمک کی خوراک ہو جائے گی۔ ہم نے دیکھا ہے دیمک کاغذ پر کچھ نقوش چھوڑ بھی دیتی ہے۔ ذوقؔ نے سچ کہا تھا:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

☆☆☆

تروینی

اردو شاعري کا نیا صنفي تجربه

ا۔ تروینی کیا ہے؟ کب اور کس نے ایجاد کی؟

تروینی ایک تین مصرعوں کی نظم ہے جسے تقریباً چار دہائیوں قبل گلزار نے ایجاد کی۔اس جدید صنف پر بات کرنے سے پہلے ہم تروینی کے موجد گلزار کی گفتگو کے اقتباسات اور کچھ فقرات جو ان کے بعض شعری مجموعوں، انٹرویو اور تقریروں میں بیان کیے گئے ہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

گلزار اپنے شعری مجموعے ''رات پشمینے کی'' میں ''میرا خیال ہے'' میں لکھتے ہیں: ''تروینی نہ تو مثلث ہے نہ ہائیکو نہ تین مصرعوں میں کہی ایک نظم، ان تینوں فارمز میں ایک خیال، ایک امیج کا تسلسل ملتا ہے لیکن تروینی کا فرق اس کے مزاج کا فرق ہے۔تیسرا مصرع پہلے دو مصرعوں کے مفہوم کو کبھی نکھار دیتا ہے کبھی اضافہ کرتا ہے یا ان پر کمینٹ کرتا ہے۔تروینی نام اس لیے دیا تھا کہ سنگم پر تین ندیاں ملتی ہیں۔گنگا جمنا اور سرسوتی۔گنگا اور جمنا کے دھارے سطح پر نظر آتے ہیں لیکن سرسوتی جو ٹیکسلا کے راستے سے بہہ کر آتی تھی وہ زمین دوز ہو چکی ہے۔تروینی کے تیسرے مصرعے کا کام سرسوتی دکھانا ہے جو پہلے دو مصرعوں سے چھپی ہوئی ہے۔

گلزار اپنے ایک ریکارڈ شدہ انٹرویو میں تروینی کے ذیل میں کہتے ہیں کہ اس تین مصرعوں کی چھوٹی سی نظم کے پہلے دو مصرعے ایک مکمل شعر ہوتے ہیں مگر تیسرے مصرعے سے یا معنی بدل جاتے ہیں یا معنی میں توسیع ہو جاتی ہے۔ کسی تقریر میں کہتے ہیں تیسرے مصرعے کی پیدایش پہلے دونوں مصرعوں سے ہوتی ہے۔ اس کا کوئی تعلق ماہیے اور مثلث سے نہیں۔

گلزار کے اس نئے صنفی تجربے ''تروینی'' کی ساخت، اہمیت اور افادیت پر اردو اور ہندی کے بعض شاعروں اور ناقدوں کے اظہار خیال میں اتفاق اور اختلاف موجود ہے۔

- ڈاکٹر قمر رئیس ''خط گلزار میں دو منظر نامے'' میں لکھتے ہیں:

''سچ تو یہ ہے کہ ذہانت کے باوجود گلزار غزل کی روایت اور اس کے مزاج سے آشنا نہیں ہو سکے۔ اسی طرح تروینی کی ایجاد بھی کرتب یا بے معنی تجربے سے زیادہ مثبت حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ یہی وہ صنف ہے جو ان کے تخلیقی تجربات اور سائنسی وژن کو سہار سکتی ہے۔''

- ف۔س۔اعجاز لکھتے ہیں:

''یوں تو تروینی کی ہیئتی شکل تین مصرعے ہیں لیکن میں انھیں چار شمار کرتا ہوں۔ شاعر دو سطریں لکھنے کے بعد ایک سطر خالی چھوڑ کر تیسری سطر لکھتا ہے۔ خالی چھوڑی گئی سطر کو بھی میں ایک مکمل مصرعہ مانتا ہوں اور اسے مصرعۂ سکوت یا مصرعہ توقف کا نام دینا چاہتا ہوں...... یہ

خاموش اور ان لکھا مصرعہ ہوا کا وہ ہلکا جھونکا ہوتا ہے جو خیالی لو میں تھرتھراہٹ پیدا کرتا ہے اور اکثر و بیشتر معنی کی سمت بدل دیتا ہے اگر ایسا نہیں تو پھر شاعر دوسرے مصرعے کے فوراً بعد تیسرا مصرعہ کیوں نہیں لکھتا۔''

- احمد ندیم قاسمی ''رات پشمینے کی'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''نظموں کے اس حیرت کدے سے نکل کر میں نے سوچا کہ گلزار کی ''تروینیاں'' پڑھنی چاہئیں کہ وہ بہت مختصر ہوتی ہیں اور ان میں گلزار کے مشاہدات واحساسات کے بیان کی گنجائش کم سے کم ہوگی مگر گلزار یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا۔ گلزار کے اپنے بیان کے مطابق تین مصرعوں کی ان نظموں کو اس نے ''تروینی'' کا نام اس لیے دیا ہے کہ پہلے دو مصرعے گنگا جمنا کی طرح ملتے ہیں اور ایک خیال، ایک تصور، ایک جذبے، ایک شعر کو مکمل کرتے ہیں لیکن ان دو دھاراؤں کے نیچے ایک اور ندی ہے۔ سرسوتی کی ندی، جو بظاہر پوشیدہ ہے اور نظر نہیں آتی مگر تروینی کا تیسرے مصرعے کا کام یہ سرسوتی دکھاتی ہے۔

اس ''تیسرے مصرعے'' کے طلسم کی دو مثالیں!

تیری صورت جو بھری رہتی ہے آنکھوں میں سدا
اجنبی لوگ بھی پہچاننے لگتے ہیں مجھے

تیرے رشتے میں تو دنیا ہی پرولی میں نے

○

کبھی کبھی بازار میں یوں بھی ہوجاتا ہے
قیمت ٹھیک تھی، جیب میں اتنے دام نہیں تھے

ایسے ہی اک بار میں تم کو ہار آیا تھا

تین تین مصرعوں کی مختصر نظموں کا سلسلہ بطور خاص آج کل عام ہورہا ہے۔ بہت سے اردو شعرا نے جاپانی صنف سخن ''ہائیکو'' کو آزمایا ہے اور اردو ہائیکو کی کتابیں تک شائع ہوگئی ہیں مگر الا ماشاء اللہ اس جاپانی صنف کے بنیادی مطالبات کم ہی پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ اس طرح اردو کے ایک معروف شاعر نے تین مصرعوں کی نظمیں کہنا شروع کیں اور انھیں ''ثلاثی'' کا نام دیا جب کہ ثلاثی برسوں پہلے سے موجود تھی اور بعض شعرا نے ماضی میں بھی ثلاثیاں لکھی ہیں۔ آج کل پنجاب لوک گیت ''ماہیا'' کو آزمایا جارہا ہے اور یہ کم سوچا جارہا ہے کہ ماہیا کے لیے ایک خاص قسم کا دیہی پس منظر، دیہی معاشرہ، دیہی کلچر درکار ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہوتا تو ''ماہیا'' کی ہیئت تو شاید برقرار رہے مگر ماہیا کا موضوع و مفہوم شکست خوردہ ہوجائے گا۔ معروف شاعر ماجد صدیقی نے پنجابی لوک شاعری کی ایک اور دلآویز صنف ''بولیاں'' میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ یہ بولی تین کی بجائے صرف دو مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے، مثلاً پنجابی کی ایک بولی:

گوری لاہ کے پزیباں رکھیاں
دھرتی نوں پھل لگ گئے

(لڑکی نے پازیبیں اتار کر رکھیں تو جیسے دھرتی پر پھول سج گئے)

مگر گلزار کی تروینی ان سب سے سراسر مختلف ہے:

زمین اس کی، زمیں کی یہ نعمتیں اس کی
یہ سب اسی کا ہے، گھر بھی، یہ گھر کے بندے بھی

خدا سے کہیے، کبھی وہ بھی اپنے گھر آئے

○

تمام صفحے کتابوں کے پھڑ پھڑانے لگے
ہوا دھکیل کے دروازہ، آ گئی گھر میں

کبھی ہوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو!

○

کوئی صورت بھی مجھے پوری نظر آتی نہیں
آنکھ کے شیشے مرے، چٹخے ہوئے ہیں کب سے

ٹکڑوں ٹکڑوں میں سبھی لوگ ملے ہیں مجھ کو

بعض شعرا نے گلزار کے تتبع میں اب تروینیاں لکھنا بھی شروع کر دی ہیں۔ یہ صنف اردو کے چومصرعے ''قطعہ'' کی طرح یقیناً کامیاب رہے گی کہ اس کی رہنمائی

گلزآر کے سے استاد کے ہاتھ میں ہے۔''

- ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط ''رات پشمینے کی'' کے تحلیل و تجزیہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے ''تروینی'' کی ان لکھی سطر کو خط سکستہ کہا ہے یعنی pause line میرے نزدیک مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونے والا کوئی شخص اچانک ایک مہیب اور گہری کھائی کے دہانے پر پہنچ جائے اور اس کی ہیبت ناک صورت اس کے دل میں خوف پیدا کردے۔ اس اثنا میں اچانک پیچھے سے ایک پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا اس کھائی کے دہانے پر سے گزر جائے۔ تو پرندے کے اس کنارے سے اس کنارے تک اڑتے ہوئے گزر جانے کے وقفہ میں اس شخص پر جو سکتہ طاری ہوجاتا ہے، وہی کیفیت یعنی مکمل خاموشی تروینی کے خط سکستہ (Pause line) میں ہوتی ہے۔ ایک اور مثال سے اس کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ سرکس میں بانس پر تلواریں اٹھائے کھڑا آدمی اچانک تلواروں کو بانس سے اچھال دیتا ہے۔ اور خود بڑی ہوشیاری سے زمین پر لیٹ جاتا ہے کہ تلواریں اس وقفہ میں بانس سے اچھل کر اس کے جسم کے اطراف زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ تلواروں کے اچھالنے سے لے کر زمین میں گڑنے تک کا منظر ناظرین کی سانسیں روک دیتا ہے۔ بس! تروینی کا خط سکستہ اسی وقفہ کے مانند ہوتا ہے۔

گلزآر کی تروینی کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ ان میں وارداتِ عشق کی کیفیات بھی ہیں اور حادثاتِ زمانہ کے احوال بھی۔ معاشرتی و اخلاقی مضامین بھی تروینی کے موضوع بنے ہیں۔ تو سماجی حالات کی عکاسی بھی ان میں ہوئی ہے۔ قدرتی مناظر کی منظر کشی بھی ان میں ہوئی ہے اور معاملاتِ زندگی کی جھلکیاں بھی ان میں دکھائی دیتی ہیں۔ غرض کہ نوع بہ نوع مضامین گلزار کی تروینی میں سموئے ہوئے ہیں۔

- ڈاکٹر حسن عباس رضا ''یہ ہے گلزار'' میں کہتے ہیں:

''گلزار کی جدت پسندی جہاں نظموں اور غزلوں میں نئی امیجری لے کر آئی ہے وہاں اس نے اردو شاعری میں ایک نئی صنف ''تروینی'' بھی متعارف کرائی ہے۔ تین مصرعوں پر مشتمل یہ صنف ماضی و حال کے ماہیے ہائیکو اور ثلاثی سے بھی ملتی جلتی ہے مگر تروینی کا تیسرا مصرعہ بظاہر الگ ہوتے ہوئے بھی خیالِ مسلسل کی عکاسی کرتا ہے۔''

- مخمور سعیدی ''رات پشمینے کی انفرادی تجربے سے اجتماعی تجربے تک'' میں لکھتے ہیں:

''گلزار نے فنی سطح پر کچھ ایسی آزادیاں اپنے لیے روا رکھی ہیں جنھیں ان سے پہلے بھی بعض شعرا نے گاہے بگاہے روا رکھا ہے مثلاً بحروں کے بعض ارکان کو توڑ دینا، سبب خفیف کو حذف کر دینا یا بڑھا دینا وغیرہ۔ لیکن گلزار نے ایسا تواتر کے ساتھ کیا ہے۔ نظموں میں اسے ان کی ترجیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر آزاد نظمیں کہی ہیں جن میں ان کا یہ اصرار چنداں گراں نہیں گزرتا لیکن کہیں کہیں تروینی میں بھی انھوں نے اسے روا رکھا ہے۔ اگر ایسا انھوں نے دانستہ کیا ہے تو بہتر ہو کہ وہ اپنے موقف پر مکرر غور کریں اور اگر ایسا نادانستہ ہوا ہے تو انھیں ایسے مقامات پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔ یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

سامنے آئے مرے، دیکھا مجھے، بات بھی کی
مسکرائے بھی پرانی کسی پہچان کی خاطر

کل کا اخبار تھا، بس دیکھ لیا، رکھ بھی دیا

دوسرے مصرعے میں لفظ خاطر کا دوسرا ٹکڑا ''طر'' وزن سے نکل گیا ہے۔

بے لگام اڑتی ہیں کچھ خواہشیں ایسے دل میں
میکسیکن فلموں میں کچھ دوڑتے گھوڑے جیسے

تھان پر باندھی نہیں جاتیں کبھی خواہشیں مجھ سے

''سے'' کا لفظ زائد ہے۔

بعض جگہ کچھ لفظ غلط تلفظ کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں وہ بھی کھٹکتے ہیں اور ایک باذوق قاری کو بدحظ کر سکتے ہیں۔

- ڈاکٹر کیول دھیر ''باتیں گلزار کی''، میں لکھتے ہیں:

''گلزار کی تروینی نے اردو شاعری کو ایک نئی ادا دی ہے۔ تین تین مصرعوں کی مختصر نظمیں مختلف ناموں سے لکھنے کے تجربے ہوتے رہے ہیں، گلزار کی تروینی کی ابتدا کے بعد آج بھی ہو رہے ہیں۔

گلزار سے پوچھا کہ آپ نے تین تین مصرعوں کی مختصر ترین نظموں کو تروینی کا نام کیوں دیا تو بولے کہ ''تروینی کے پہلے دو مصرعے گنگا جمنا کی مانند ملتے ہیں اور جس ایک شعر کو مکمل کرتے ہیں اس میں ایک خیال، ایک تصور، ایک جذبہ ہوتا ہے، لیکن دو دھاروں کے نیچے ایک اور ندی ہے سرسوتی کی ندی جو بظاہر پوشیدہ ہے مگر تروینی کا تیسرے مصرعے کا کام یہ سرسوتی دکھاتی ہے۔

گلزار کی تروینی کا تیسرا مصرع تخلیقی عمل کا جادو جگاتے ہوئے اپنے من کے درد کا اظہار کس طرح کرتا ہے ملاحظہ ہو:

کوئی صورت بھی مجھے پوری نظر نہیں آتی
آنکھ کے شیشے مرے چٹخے ہوئے ہیں کب سے

ٹکڑوں ٹکڑوں میں سبھی لوگ ملے ہیں مجھ کو

اور جب وہ چاہت کا اظہار کرتا ہے تو کچھ اس طرح:

تیری صورت جو بھری رہتی ہے آنکھوں میں سدا
اجنبی لوگ بھی پہچانے سے لگتے ہیں مجھے

تیرے رشتے میں تو دنیا ہی پرولی میں نے

درد کے بھی تو کئی روپ ہیں، کئی احساسات ہیں، کئی پڑاوٴ ہیں اور اس میں چاہت کی آمیزش ہو جائے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے:

خفا رہے وہ ہمیشہ تو کچھ نہیں ہوتا
کبھی کبھی جو ملے، آنکھیں پھوٹ پڑتی ہیں

بتائیں کس کو بہاروں میں درد ہوتا ہے!

گلزار کی تروینی میں ایک احترام اور چاہت کے ساتھ تڑپ اور کسک کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے:

ہوائیں زخمی ہو جاتی ہیں کانٹے دار تاروں سے
جبیں گھستا ہے دریا جب تری سرحد گزرتا ہے

مرا اک یار ہے، دریائے راوی پار رہتا ہے!

گلزار کی یہ تریوینیاں دراصل وہ پیاری پیاری باتیں ہیں جن میں ایک بھرپور چاہت، خلوص، درد اور کسک کے ساتھ زندگی کبھی مچلتی ہے تو کبھی تڑپ محسوس کرتی ہے:

تمام صفحے کتابوں کے پھڑپھڑانے لگے
ہوا دھکیل کے دروازہ آ گئی گھر میں

کبھی ہوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو!

- عبدالاحد سازؔ ''رنگ ہے مہک جیسا نقش ہے جدا جیسا'' میں لکھتے ہیں:

''گلزار اختصار و ایجاز کے شاعر ہیں اور بین السطور میں اپنی بات کہنے کا ہنر رکھتے ہیں، لہٰذا یہ عین متوقع تھا کہ وہ کسی مختصر صنفِ نظم کی طرف راغب ہوں۔ اس رغبت نے ان پر ایک منفرد صنف ''تروینی'' کی راہ کھول دی ہے۔ تین سطری صنفِ نظم دیگر سہ سطری اصناف مثلاً ثلاثی، ماہیہ، ہائیکو وغیرہ سے یوں مختلف ہے کہ ان اصناف کی تخصیص ان کے بحر و وزن اور مصرعوں کی ترتیب سے ہے۔ گلزار کی تروینی کی خصوصیت اس کی ہیئتی تکنیک نہیں بلکہ اس کا معنوی التزام ہے۔ اس طرح کہ اس میں جو تیسرا مصرع ہے وہ اگلے دو مصرعوں کے درمیان سے معنوی طور پر ابھر کر بین

السطور کی کوئی سمت متعین کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دو تروینیاں ملاحظہ ہوں:

روز اٹھ کر چاند ٹانکا ہے فلک پر رات کو
روز دن کی روشنی میں رات تک آیا کیے

ہاتھ بھر کے فاصلے کو عمر بھر چلنا پڑا

○

سب پہ آتی ہے سب کی باری ہے
موت انصاف کی علامت ہے

زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی!

تروینی کی ساختیات، لسانیات، تصرفات، خصوصیات اور اس کے مضامین کی کیفیات خارجی اور داخلی واردات کی تفصیلات میں جانے سے قبل ہم مختصر مگر اجمالی طور پر اردو اشعار کی اقسام پر روشنی ڈالیں گے تاکہ فنی طور پر ایجاد اور موجد کے ساتھ ساتھ قارئین سے بھی انصاف ہو سکے۔

اقسام شعر: عروض کی مستند کتابوں میں شعری اور موضوعی ہیئتوں میں فرد، رباعی، قطعہ، غزل، قصیدہ، مثنوی ترجیع بند، مرثیہ، ترکیب بند، مستزاد و مسمط کی شکلیں مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متمسع اور معشر شامل ہیں۔

اس کے علاوہ بعض مغربی دیسی اور جدید ہیئتیں جیسے اسٹینزا، سانیٹ، نظم معری، آزاد نظم، ترائیلے، ہائیکو، ثلاثی، تثلث، دوہے، ماہیے، ترویٖنی، سہ مصرعی، تتلیاں، ترسیلے، مثلث، تپائی اور تکونی وغیرہ بھی نظر آتی ہیں۔ چونکہ ہمارا موضوع ترو ینی ہے جو تین مصرعوں پر مشتمل نظم ہے اس لیے ہم یہاں قدیم اور جدید تین مصرعوں کی اصناف معروف اور غیر معروف کو بہت ہی مختصر تعریف اور تعارف سے پیش کرتے ہیں۔

ا: مثلث: قدیم تین مصرعوں کا بند ہے جو مسمط کی ایک قسم ہے جس میں تین مصرعے ایک ہی بحر میں اور مقفّٰی ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں مثلث کے نمونے اچھی تعداد میں ملتے ہیں۔

ب: ہائیکو: جاپانی صنف ہائیکو کی طرح 7,5 اور 5 بلز (دوحرفی لفظ) میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے تینوں مصرعے آزاد ہوتے ہیں۔

ج: ماہیے: یہ قدیم پنجابی صنف ہے جو ڈیڑھ مصرعی صنفِ سخن ہے۔

د: تثلیث، ثلاثی: یہ صنف تین مصرعوں کی جدید صنف ہے جس کے موجد حمایت علی شاعر ہیں اسے بعد میں ثلاثی میں بدل دیا گیا۔ ثلاثی میں تین مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔

ہ: ترسیلے: علم صبا نویدی نے اپنی تین مصرعوں کی نظم کو ترسیلے کا نام دیا ہے۔

و: تکونی: اس صنف میں تین بند اور بارہ مصرعے ہوتے ہیں۔

ز: **تپائی:** کسی مزاحیہ شاعر نے اپنی تین مصرعوں کی نظم کو تپائی لکھا ہے۔

ح: **سہ سطری:** مخلص قریشی نے اپنی تین مصرعوں کی نظم کو سہ سطری نام دیا ہے۔

اسی طرح سے بعض شاعروں نے مثلثی، سہ مصرعی، مثلث، تتلیاں، کجری وغیرہ نام دیے ہیں جو ناکام انفرادی تجربوں سے زیادہ کچھ شعر و ادب کی خدمت نہ کر سکے۔ ہم نسبتاً تفصیل سے تروینی کو جس کے موجد گلزارؔ ہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

ف ۱: تروینی میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔

ف ۲: پہلے دو مصرعے ایک مکمل شعر کی شکل میں ہوتے ہیں۔

ف ۳: تینوں مصرعے ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں ان کو کسی بھی بحر میں لکھا جا سکتا ہے۔

ف ۴: تینوں مصرعے ردیف اور قافیے کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

ف ۵: تروینی میں تیسرا مصرعہ پہلے دو مصرعوں سے پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے نظم کے معانی میں تبدیلی یا معنی آفرینی یا وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

ف ۶: گلزار جو تروینی کے موجد ہیں گذشتہ چالیس سال سے مسلسل اس کو لکھ رہے ہیں۔ ان کو تروینیاں پہلی بار ستّر کی دہائی نے کملیشور نے سا گا میں شائع کی تھیں۔ اب تروینی لکھنے کا رواج عام ہو رہا ہے۔

ف ۷: اگر چہ تروینی کا جس طریقے پر استقبال ہونا تھا ابھی تک نہ ہوا لیکن اس کے باوجود تروینیاں لکھی جا رہی ہیں۔

ف ۸: تمام تین مصرعوں کی نظموں میں تروینی سہل اور متنوع ہے جس میں ردیف اور قافیے کی پابندیاں نہ ہونے سے مضامین کی کثرت نظم کی جا سکتی ہے۔ اور مبتدی اور اساتذہ اپنے کمال و فن کے جوہر اپنی اپنی قوت استطاعت کے

تحت بتا سکتے ہیں۔

ف۹: ''تروینی'' مختصر تین مصرعوں کی نظم ہونے کی وجہ سے ایجاز اور اختصار کی ریاضت فراہم کرتی ہے۔ یہاں قافیہ پیمائی نہیں اور ردیف کی حد بندی بھی نہیں ہوتی۔

ف۱۰: ''تروینی'' ہندوستانی نژاد نظم ہے جس کی فارسی اور عربی میں کوئی مثال نہیں۔ اس کا قبیلہ اردو اور پنجابی کے دو تین مصرعوں کی نظموں اور گیتوں سے جوڑا جا سکتا ہے مگر یہ صنف خود ایک مستقل صنف ہے۔

ف۱۱: ''تروینی'' ہندستانی عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے۔

ف۱۲: ''تروینی'' تکلّمی آہنگ کی وجہ سے آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے، چنانچہ جب گلزار اس کو پڑھتے ہیں تو مصرعوں کے اُتار چڑھاؤ، لہجے کے زیر و بم سے اس کے اثر کو دو آتشہ کر دیتے ہیں۔

ف۱۳: ''تروینی'' میں ہندی کے رسیلے شبدوں کے علاوہ انگریزی کے مروجہ الفاظ برتے گئے ہیں، جو اکیسویں صدی اور گلوبل ولیج کی موجودہ شاعری کی پہچان بھی ہے۔

ف۱۴: ''تروینی'' کو تدریسی نصاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ گلدستے کی طرح ان میں روایتی موضوعات کے علاوہ ترقی پسند عناصر، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور عصری حسیّت کی جھلکیاں موجود ہیں جو زبان کے تحفظ اور ارتقا میں ضروری ہیں۔

☆☆☆

منتخب تروینیوں کا اجمالی تجزیہ

تروینیوں کے گلشن کی سیر سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ گلزار کا کلام خود گلزار کی طرح ہر طرح کے پھولوں سے رنگ برنگ ہے۔ چنانچہ ہم نے نظموں، غزلوں، گیتوں اور ترائیلوں وغیرہ پر کسی قسم کا تبصرہ اور تجزیہ کیے بغیر یہاں صرف اور صرف تروینی کو اپنی گفتگو کا مرکز بنایا ہے۔

○

دیر تک آسماں پہ اڑتے رہے
اک پرندے کے بال و پر سارے

باز اپنا شکار لے کے گیا

اس تروینی کے پہلے دو مصرعے ایک منظر پیش کر رہے ہیں جو شاعر کا مشاہدہ ہے۔ہم سب جانتے ہیں جب عقاب کسی پرندے کا شکار کرتا ہے تو پہلے اس کے بال و پر نوچ دیتا ہے تاکہ وہ پھر اُڑ نہ سکے اور اس طرح بے کس اور بے بس ہو کر عقاب کا نوالہ بن جائے۔ چنانچہ پرندے کے بال و پر آہستہ آہستہ زمین پر آنے لگتے ہیں

کیونکہ عقاب یہ عمل اونچے درختوں یا چٹانوں پر کرتا ہے اور ویسے بھی عقاب کو پرندے کے بال و پر سے رغبت نہیں رہتی۔

یہاں تروینی کے تیسرے مصرعے نے حیرت یا Suspense کو ختم کر دیا کہ یہ باز کی وجہ سے بال و پر منتشر ہوئے۔ تیسرے مصرعے نے مضمون کو وسعت بھی دی، لیکن اس تروینی کی معنی آفرینی اس میں پوشیدہ اصل حقیقت سے ہے جو شاعر کا مدعا ہے۔ یعنی یہاں شاعر نے دنیا کی بے ثباتی، انسانی کی بے بسی اور موت کے قوی پنجوں کا ذکر اس روزانہ ہونے والے مشاہدے سے کیا ہے۔ یہاں انسان کی زندگی بھر کا حاصل اس کی ملکیت، اس کے کاروبار، اس کے لباس وسائل، دولت اور اس کا بے جان جسم سب کچھ مدت کے لیے دنیا میں بکھرے پڑے رہتے ہیں جب اُسے موت اپنا شکار بنا لیتی ہے بالکل اسی طرح سے جیسے ایک باز کسی پرندے کو اٹھا کر اپنا لقمہ بناتا ہے اور اس کے بال و پر کچھ عرصے کے لیے اُڑتے بکھرتے نظر آتے ہیں اور کچھ دیر بعد وہ بھی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں گلزار نے موت کی عمدہ پیکر سازی کی ہے۔

تروینی اگر چہ چھوٹی تین مصرعوں کی مکمل نظم ہے لیکن اگر شاعر عمدہ فکر نادر تخیل اور الفاظ کے دروبست سے واقف ہو تو ان تین مصرعوں میں شش جہتی مطالب سمو سکتا ہے۔ مصرعہ دوم کے فقرے ''بال و پر سارے'' کو گلزار نے اپنے شعری مجموعہ کا عنوان بھی قرار دیا ہے۔ پوری تروینی روز مرہ کے سیدھے سادے الفاظ میں صنعت مراعات النظیر کا گلدان معلوم ہوتی ہے۔

صنعت مراعات النظیر = پرندے۔ بال و پر۔ اڑتے۔ باز۔ شکار۔

○

کچھ خوابوں کے خط ان میں، کچھ چاند کے آئینے سورج کی شعاعیں ہیں
شعروں کے لفافے ہیں کچھ تجربے ہیں میرے، کچھ میری دعائیں ہیں

نکلو گے سفر پر جب، یہ ساتھ میں لے لینا، شاید کہیں کام آئیں

اس تروینی میں جو''بوسکی کے لیے''لکھی گئی ہے، باپ کی نصیحت ہے جو بیٹی کے لیے مصرعوں میں لکھّی گئی ہے، یہ نصیحت تمناؤں، تجربوں اور دعاؤں کے خمیر سے بنی ہے۔ تمنا دل کے الاؤ سے سوز و گداز لیتی ہے۔ تجربے کتابوں میں نہیں بلکہ بال سفید کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ دعائیں خریدی نہیں جاسکتیں۔ یہ قدریں مادی نہیں بلکہ معنوی ہیں۔ شاعر نے یہاں اگر چہ کہ پیکروں اور استعاروں میں مطلب پیش کیا ہے لیکن معنی آفرینی ان پیکروں کی ظاہری اور باطنی علامات سے ظاہر ہے۔ خوابوں کے خط باپ کی آرزو اور تمنا ہے بیٹی کے لیے۔ چاند علامت ہے حُسن کا، محبت کا، سکون کا، اطمینان اور آسودگی کا۔ سورج علامت ہے ترقی کا، کامیابی اور سرخ روئی کا۔ یہاں باپ مصرعوں کے قالب میں اولاد کو تجربے اور دعائیں دے رہا ہے جو صرف تعلیم اور تعلم سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے راستے پر ٹھوکریں کھا کھا کر سنبھلنے سے ملتے ہیں اس لیے باپ کہتا عملی زندگی میں تنہا سفر کروگے تو شاید ضرورت پڑے گی اس لیے اِسے اپنے زادراہ کی گٹھری میں باندھ لینا۔

یہ نظم اگر چہ بظاہر شاعر کی نور نظر سے منسوب ہے لیکن یہ صلائے عام ہے جس میں ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کامیاب تجربوں کی اہمیت اور نصیحتوں کی

قدر و قیمت بتائی گئی ہے۔اس ترو ینی کی حسن آفرینی یہ بھی ہے کہ یہاں تیسرے مصرعے کی شمولیت سے معنی زندگی کے سفر پر جمع ہونے لگتے ہیں یعنی سفر کے لیے راستوں کے پیچ وخم پر اجالے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو چانداور سورج کی دین ہے اور واقفیت اور مہارت درکار ہوتی ہے جو تجربوں سے حاصل ہوتی ہے اور ان تمام نکات کو رکھتے ہوئے بھی الہامی مدد یعنی دعا اور نیک خواہشات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تیسرے مصرعے نے نہ صرف معنی میں اضافہ کیا بلکہ نئے معنی بھی پیدا کیے۔

تینوں مصرعے ایک ہی بحر میں، سیدھے سادے الفاظ سے بنائے گئے ہیں۔ تمام مصرعوں میں ایک بھی اضافت نہیں، نادر اور جدید معانی کے دریچے ''خوابوں کے خط'' ''چاند کے آئینے'' اور ''شعروں کے لفافے'' سے کھولے گئے ہیں۔ صنعت مراعات النظیر میں چاند، سورج، شعاعیں اور خط، شعروں، لفافے شامل ہیں۔ یہ نظم عام فہم ہے اس کے ابلاغ میں کوئی دشواری نہیں۔

○

شعلہ سا گزرتا ہے مرے جسم سے ہو کر
کس لَو سے اُتارا ہے خداوند نے تم کو

تنکوں کا مرا گھر ہے کبھی آؤ تو کیا ہو

اس عشقیہ ترو ینی میں عاشق اور معشوق کی واردات کو پیش کیا گیا ہے۔ معشوق نہ صرف شعلہ بدن ہے بلکہ شعلۂ فشاں اور شعلہ انگیز ہے۔ اسی لیے عاشق کا بدن بھی شعلے بدن سے شعلہ ور ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے شمع کی لَو سے پروانہ۔ یہ دو

مصرعے کامل شعر ہیں۔ اِسے غزل کے عمدہ شعروں میں تغزل کی بنیاد پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ ردیف اور قافیے سے مستثنیٰ مصرعے بحر میں رواں دواں ہیں۔ تیسرے مصرعے نے اس بیانیہ عشقی واردات کو سوالیہ عشق وحیرت کا مرقع بنادیا۔ شعلہ شمع کا تاج اور لَو تاج پر طرّہ ہے جو یہاں معشوق کا سراپا ندرت بیان میں آسان الفاظ میں "لَو سے اتارا" گیا ہے۔ پہلے معشوق کا اثر عاشق پر دکھایا گیا ہے پھر شعلہ بدن کی تعریف اور تحلیل کر کے معنیٰ کو معراج تک پہنچا دیا گیا ہے۔ نیز عاشق کی کم مائیگی اور معشوق کی برتری اس کی جلالت اور اہمیت دکھائی گئی ہے۔ شعلے اور تنکے کے ملاپ سے کیا ہوتا ہے۔ تجربہ دکھا چکا ہے۔ اگرچہ پروانہ شمع کی لو سے ٹکرا کر فنا ہو جاتا ہے لیکن اس فنا سے اُسے ابدی بقا حاصل ہوتی ہے۔ تیسرا مصرعہ صنعت ایہام میں میرا گھر شاعر کا گھروندا یا شاعری کا بدن بھی ہوسکتا ہے۔ پوری تروینی میں مصرعے کی آخری وجہ سے ایک خوبصورت دلکشی ہے۔ اس ایک مصرعے نے پہلے دو مصرعوں کو فلک بوس کر دیا۔

○

نہ ہم مڑے نہ کہیں راستہ مڑا اپنا
نشیب آئے کہیں، اور کہیں فراز آئے

میں نیچے نیچے چلا تم بلندیوں پہ رہیں

عشقیہ تروینی ہے۔ عاشق اور معشوق کی جدائی کے راز کو تیسرے مصرعے نے بیان کر دیا ہے۔ یہاں مضمون جدید ہے۔ ندرت بیان کے ساتھ ساتھ تیسرے مصرعے نے ابہامی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔ عام طور پر عاشق اور معشوق کی جدائی

کو الگ الگ راستوں پر چلنے یا خوشی وغم میں ساتھ نہ دینے کی وجہ بتائی جاتی ہے لیکن یہاں گلزار نے عاشق ومعشوق کو ایک ہی راستے پر گامزن بتایا ہے یہی نہیں بلکہ زندگی کے غم وخوشی، آسان اور مشکل حالات میں بھی ایک دوسرے کے شریک بتایا ہے چنانچہ ان دو مصرعوں میں یکسانیت دکھا کر فکری، علمی، اقتصادی فرق کے دروازے کھول دیئے ہیں کہ عاشق نیچے یا پائین تہوں میں تھا اور معشوق بلندیوں کا حامل تھا جس نے اس وصل کو فصل میں تبدیل کر دیا۔ مضمون آسان الفاظ میں بغیر کسی اضافت اور ادق الفاظ کے ایک ہی بحر میں سمویا گیا ہے۔ پوری تروینی کے مصرعوں میں الفاظ کی تکرار اور صنعت تضاد کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔

صنعت تکرار = مڑے، مڑا۔ کہیں، کہیں۔ آئے، آئے۔ نیچے نیچے

صنعت تضاد = نشیب، فراز۔ نیچے، بلند۔ ہم، تم

صنعت ابہام = نیچے اور بلندیوں کو اوپر اور نیچے کے علاوہ Status کے اونچ نیچ یا فکر وعلم وفن کے دو کناروں کو بھی لیا جا سکتا ہے۔

اس تروینی کے تیسرے مصرعے نے پہلے دو مصرعوں میں جو تشنگی تھی اس کو سیراب کر کے نئے مضمون کا گل کھلایا ہے جس کی وجہ سے اس کا اثر بڑھ گیا ہے۔

○

بے لگام اڑتی ہیں کچھ خواہشیں ایسے دل میں
''میکسیکن'' فلموں میں کچھ دوڑتے گھوڑے جیسے

تھان پر باندھی نہیں جاتیں سبھی خواہشیں مجھ سے

غالبؔ نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

غالبؔ کے عاشق گلزارؔ نے خواہش کو بے لگام وحشی گھوڑا بتایا ہے اور ''میکسیکن'' گھوڑوں کی تلمیح پیش کر کے سامع اور قاری کو اپنے تجربے میں شریک کیا ہے۔ یہاں پوری تروینی کا مرکز خواہش ہے جس کو نادر تشبیہ کے ساتھ پیش کیا ہیلیکن تروینی کے تیسرے مصرعے نے نہ صرف اس کے معنی کو وسعت دی بلکہ مضمون کو دو آتشہ کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے جیسا کہ غالبؔ نے کہا ہے ہزاروں خواہشیں نکلنے کے بعد بہت زیادہ خواہشیں سینے میں دفن ہی رہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ خواہشیں میرے اختیار یا کنٹرول میں نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کو میں رام نہیں کر سکتا۔ یہ پورا شعر صنعت مراعات النظیر میں ہے۔ جیسے لگام، گھوڑے، تھان وغیرہ۔ خوبصورت تلمیح اور متحرک تشبیہہ بھی ''میکسیکن'' گھوڑوں کی ہے۔ شاعر نے نرم اور رائج انگریزی الفاظ میکسیکن، فلم وغیرہ کو اچھا برتا ہے جس سے اردو آنے والے اور موجودہ دور سے جڑی ہوئی ہے۔

○

سامنے آئے مرے دیکھا مجھے بات بھی کی
مسکرائے بھی پرانی کسی پہچان کی خاطر

کل کا اخبار تھا بس دیکھ لیا رکھ بھی دیا

یہ ایک عشقیہ وارداتی تروینی ہے۔ اس تروینی کا سارا طلسم ''کل کے اخبار''

میں بند ہے۔ اچھی شاعری کی پہچان یہ بھی ہے کہ منظر کشی ایسی کی جائے کہ وہ مرقع کشی ہو جائے یعنی مناظر الفاظ کی وجہ سے اسٹیج ہو جائیں۔ یہاں پہلا شعر عشقیہ یادداشت ہے جس کو تیسرے مصرعے نے داخلی واردات بنا دیا ہے۔ تیسرے مصرعے نے نہ صرف وسعت بیانی عطا کی بلکہ معنی کو نیا رنگ بھی دیا۔ پس معلوم ہوا کہ گلزار نے ایک معمولی شعر کو ''کل کے اخبار'' کے طلسم سے شعریت کے فلک پر سورج بنا دیا۔ تصور میں لائے ایک گزرے ہوئے کل کے اخبار کو جو ٹیبل پر دھرا ہے۔ آپ اس سے واقف ہیں اس میں کچھ ایسی خبریں ہیں جو آپ کو خوش کرتی ہیں آپ انھیں پسند کرتے ہیں اور بعض کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں بہر حال تمام اخبار پر ایک لمحہ نظر ڈال کر ہٹا دیتے ہیں۔

یہاں مصرعوں میں الفاظ ایسے جمائے گئے ہیں کہ یہ مصرعے نثری سطریں معلوم ہوتی ہیں جو اچھی شاعری اور روزمرہ کی پہچان ہے۔ شبلی کہتے ہیں اچھا شعر وہ ہے جس کی نثر نہ ہو سکے یعنی وہ خود نثر کی طرح سے لکھا گیا ہو۔

اس نئی صنف کی خوبی یہ بھی ہے کہ تیسرے مصرعے کی بدولت معنی آفرینی کے نئے دروازے کھُل رہے ہیں اور شاعر شاعری کی تاثیر اور وسعت میں اضافہ کر رہا ہے اور یہی اچھی اور بڑی شاعری کی شناخت بھی ہے۔

○

وہ میرے ساتھ ہی تھا دور تک، مگر اک دن
جو مڑ کے دیکھا تو وہ دوست میرے ساتھ نہ تھا

پھٹی ہو جیب تو کچھ سکّے کھو بھی جاتے ہیں

اس تروینی میں انسان کی خودغرضی، احسان فراموشی، جو ہر دور کا المیہ رہا ہے بیان کیا گیا ہے۔ مشہور ہے خوشی میں سب ساتھی اور غم میں اپنا سایہ بھی دور بھاگتا ہے۔ شعر کے دو مصرعے کسی بھی عنوان میں لیے جا سکتے ہیں یعنی دوست دیرینہ یعنی ہمدم جو ہم قدم بھی تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔ تیسرے مصرعے نے اس ساتھ چھوڑنے کی وجہ بتا دی۔ یہاں گلزار نے پھٹی جیب کو نئے محاورے کے ساتھ منطق سے بھی جوڑا ہے کہ جب جیب پھٹی ہو تو چند سکّے گر جاتے ہیں، یہ ایک تجربہ اور مشاہدہ ہے جس سے سبھی واقف ہیں۔ یعنی معلوم ہوا کہ اگر تروینی کا تیسرا مصرعے جاندار اور محکم ہو تو معنی میں کمال حاصل ہو سکتا ہے۔ اس تروینی کا مصرع بھی روزمرہ میں ہے جس کی نثر نہیں ہو سکتی، کیونکہ خود نثر کے مانند بحر میں لکھا گیا ہے۔ پہلے شعر کی واردات کو تیسرے مصرعے کی منطق سے محکم کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں۔

اسی طرح کے مضمون کو ایک اور تروینی میں کچھ الفاظ بدل کر پیش کیا ہے۔ جہاں دوست خود نہیں چلا گیا بلکہ اسے کوئی لے گیا اور پھر وہ نہیں آیا اور اس کی جگہ خالی پڑی رہی لیکن یہاں مضمون بالکل الگ ہے پھر بھی تجربے اور مشاہدے کی پیکر سازی میں جدت ہے۔ یہاں جو دوست اور احباب شاعر کے ساتھ ہمیشہ رہتے تھے انھیں موت نے چھین لیا اور پھر وہ نہیں لوٹے ان کی جگہ لیکن شیلف سے نکلی ہوئی کتابوں کی جگہ کی طرح خالی ہی رہی۔ شیلف سے جو کتاب نکل جاتی ہے اس کی جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں کتاب یہاں سے اٹھالی گئی ہے۔ ہمارے برصغیر کی ایک کمزور تہذیبی روایت کتاب کو لینے کے بعد اس کے واپس نہ کرنے کی بھی ہے۔ چنانچہ شاعر نے

بہت ہی سادہ اور عام فہم طریقے سے مطلب ادا کیا اور پھر پہلے دو مصرعوں کے رمز کو تیسرے مصرع سے وسعت دے کر اصل معنی کی طرف ذہن کو متوجہ کیا۔ تروینی کے تیسرے مصرع سے اس کی شعریت اور معنی آفرینی کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ رباعی کے آخری مصرعے سے لیکن رباعی میں ہمیشہ وہی مضمون جس کو تینوں مصرعوں میں اٹھایا گیا ہے ایک خاص طریقے سے پیش کر کے نکھارا جاتا ہے۔ جس تروینی کے بارے میں ہم نے اوپر چند سطروں میں ذکر کیا ہے وہ اس طرح ہے۔

O

کچھ مرے یار تھے رہتے تھے مرے ساتھ ہمیشہ
کوئی آیا تھا انھیں لے کے گیا پھر نہیں لوٹے

شیلف سے نکلی کتابوں کی جگہ خالی پڑی ہے

اکیسویں صدی میں اردو شاعری کو پھیلنے اور باقی رہنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت بھی ہے جس کے لیے فن میں سہولتیں پیدا کرنا ضروری ہے۔ آج کا انسان پہلے کے انسان سے زیادہ مصروف اور پُر تحرک ہے وہ آج کی ٹکنالوجی کی وجہ سے ساری دنیا سے جڑا ہوا ہے اس کا مشاہدہ اور تجربہ کئی گنا ہے۔ کنویں کے مینڈک کے لیے ساری کائنات اس کا کنواں ہے لیکن عقاب کے لیے صحرا، مرغزاروں اور کوہساروں کی پستیاں اور بلندیاں شکار حاصل کرنے کے لیے اپنی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ قدیم یا متوسطین شعرا محدود نظر تھے۔ وہ تو اتنے بلند تھے کہ آج ہم ان کی وسعت نظر کو پہنچ بھی نہیں سکتے، یہاں ہم عوام اور عام

لوگوں کی وسعتِ فکری اور وقت کی فراہمی کے ساتھ فن کی وابستگی کو واضح کر رہے ہیں کہ اگر فن میں انھیں سہولتیں نہ ہوں تو یہ خیالات یہ جدید جدید تخیلات سینے ہی میں دم توڑ دیں گے، کوشش یہ ہو کہ جذبات داخلی اور خارجی واردات الفاظ کا جامہ پہن کر کاغذ پر ظاہر ہوں۔

○

اک نوالے سی نگل جاتی ہے یہ نیند مجھے
ریشمی موزے نگل جاتے ہیں پاؤں جیسے

صبح لگتا ہے کہ تابوت سے نکلا ہوں ابھی

گلزار نے اس تروینی کو ندرتِ فکر سے آراستہ کیا ہے۔ آج کے سائنسی علم کے مطابق نیند اور موت میں مشابہت ہے، شاید نیند آدھی موت ہو اسی لیے موت کو ابدی نیند بھی کہتے ہیں جس طرح ریشمی موزے چسپاں طور پر پاؤں کو ایسا پہن لیتے ہیں کہ پاؤں ہوتے ہوئے بھی نہیں معلوم ہوتے۔ اُسی طرح نیند انسان کے حواس کو ایسا نگل لیتی ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردے کی طرح بے حواس رہتا ہے۔ یہاں تروینی کے تیسرے مصرعے نے نیند کو موت کے دامن سے جوڑ دیا ہے جس کے لیے تابوت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس تروینی کا داخلی عمل جو سرسوتی کی طرح نہاں ہے ''موت'' ہے جو تیسرے مصرعے میں آ کر ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر نے تابوت کے لفظ سے مضمون کو نیا رخ دیا ہے۔ صنعت مراعات النظیر میں نوالے، نگل، پاؤں اور موزے شامل ہیں۔

اتنے عرصے بعد ہینگر سے کوٹ نکالا
کتنا لمبا بال ملا ہے کالر پر

پچھلے جاڑوں میں پہنا تھا یاد آتا ہے

شاعری جذبات اور محاکات نگاری ہے۔سبب سے مسبب کو جاننا مجاز مرسل ہے جو محاسن شاعری میں داخل ہے۔شاعر نے لمبا بال کالر پر لکھ کر معشوق کے گلے لگنے کا جواز پیش کیا ہے۔اس شعر کا حُسن یہ ہے کہ کہیں بھی معشوق، ملاقات یا عشقیہ واردات کا لفظی تذکرہ نہیں لیکن ان تمام کے نہ ہوتے ہوئے بھی مضمون پورا روشن ہے۔حالؔی نے یادگار غالبؔ میں:

جب میکدہ چھٹا تو رہی کیا جگہ کی قید مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا سب سے بڑا حُسن یہ ہے کہ پورے شعر میں کہیں بھی شراب، ساقی اور دیگر لوازمات کے بیان کے بغیر معنی ظاہر ہیں۔

پہلے دو مصرعوں سے معلوم ہوا کہ شاعر کی ملاقات معشوق سے ہوئی تھی۔ہماری برصغیر کی حسن نگاری میں لمبے بال بھی شامل ہیں۔تیسرے مصرعے نے نہ صرف اس ملاقات کے وقت کا تعین کیا بلکہ اِسے ایک یاد بنا کر جدائی کی منظر نگاری بھی کر دی جو عشقیہ شاعری کی درد و کسک شمار کی جاتی ہے۔ترو ینی میں ہر قسم کے عام فہم مستعملہ الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں جیسے ہینگر، کالر، کوٹ وغیرہ۔

یہاں تروینی کی بدولت ایک تجربے یا ایک واقعے نے ایک انوکھے پُر تاثیر

مضمون کو جنم دیا جو شاید غزل یا مثنوی وغیرہ میں ممکن نہ تھا۔

○

کچھ اس طرح خیال ترا جل اٹھا کہ بس
جیسے دیا سلائی جلی ہو اندھیرے میں

اب پھونک بھی دو، ورنہ یہ انگلی جلائے گی

یہ ترو ینی عشقیہ کیفیات کی عکاس ہے۔عشق سوز وسوزش، درد و جلن، تڑپ اور گداز کا حامل ہے۔معشوق کا خیال اور تصور جو وقتاً فوقتاً شعلے کی طرح دل میں اٹھتا ہے کہ تاریک خانۂ دل میں روشنی کے ساتھ ساتھ آگ بھی لگا دیتا ہے بالکل اُسی طرح جیسے ایک دِیا سلائی اندھیرے میں شعلہ اور روشنی پیدا کرتی ہے۔ یہ دو مصرعے یا ترو ینی کا مکمل شعر غزل یا نظم کا عمدہ شعر بن سکتا ہے یہاں محاکات ایک سطحی ہیں ایک انوکھا خیال ہے جو دقیق بیانی سے تراشا گیا ہے۔

اب تیسرے مصرعے نے پورے مضمون میں نئی روشنی بھر دی۔ یہی ندرت اور شعر آفرینی ہے۔ اگر جلتی دیا سلائی ہاتھ میں جلتی رہے تو انگلی جل جائے گی۔ صرف اگر یاد کے شعلے سینے میں بھڑکتے رہیں تو سینے کو خاک کر دیں گے، پھر درد و گداز کا احساس بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اِسے کبھی کبھی بجھا دینا بھی پڑتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ عشق میں فنا ہو کر بقا کے مقام کو حاصل کیا جائے۔ میر انیسؔ کا شعر ہے:

شمع کشتہ ہوں، فنا میں ہے بقا میرے لیے
خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے

○

تمام صفحے کتابوں کے پھڑپھڑانے لگے
ہوا ڈھکیل کے دروازہ آگئی گھر میں

کبھی ہوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو

عشقیہ ترویج ہے۔ ہوا کے جھونکے کے اثر کی منظر نگاری ہے جو شدت سے دروازہ کھول کر گھر میں آئی اور کتابوں کے صفحوں کو چھیڑنے لگی۔ یہ منظر ہر وقت ہوتا رہتا ہے اور اس تجربے سے ہر چھوٹا بڑا واقف ہے۔ یعنی پہلے شعر کے دو مصرعے ایک حالت اور کیفیت کو بیان کر رہے ہیں جس میں چنداں تاثیر نہیں لیکن تیسرے مصرعے جس کا گمان بھی پڑھنے والے کو نہ تھا خالی تصویر میں عشقیہ رنگ بھر دیتا ہے۔ حُسن کی بیشمار ادائیں ہیں جن میں ناز ونخرے، روٹھنا، دشنام کرنا، غرور وگھمنڈ، تعریف وتجلیل، کے ساتھ ساتھ عاشق کی منت سماجت اور حُسن کے پاؤں تلے آنکھیں بچھانا بھی شامل ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کاش کبھی تم بھی یہ رسمی اخلاقی اور حسنی رکاوٹوں کو چھوڑ کر میرے پاس آجاتیں تو بات بنتی۔ سچ تو یہ ہے کہ سچے عشق میں بناوٹ نہیں بلکہ دل سے دل کو راستہ ہے۔ اسی لیے اس کا اثر شدید اور لا فانی ہے۔

حضرت غالبؔ کا ایک شعر معشوق سے بلا تکلف جھپٹ کر بوسہ لینے پر ہے۔

ہست تفاوت بسی ہم ز رطب تا نبیذ
لذت دیگر دہد بوسہ جو دشنام شد

یعنی فرق ہے کھجور جو میٹھا ہے اور اس کی شراب جو کڑوی ہوتی ہے مگر کھجور کی

مٹھاس چند لمحوں کے لیے اور شراب کا سرور طولانی ہے پس جو بوسہ معشوق سے زبردستی دشنام کے ساتھ ہو اس کا اثر اور مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

یہ معلوم ہوا کہ بناوٹ اور رسمی دعوت وغیرہ کے بغیر معشوق ہوا کی طرح دروازہ ڈھکیل کر آ جائے تو اس کا مزا اور مقام کچھ اور ہی ہوگا۔ عاشق خوشی اور بے خودی سے بے قرار ہو گیا جس طرح ہوا کے جھونکے سے کتاب کے صفحات پھڑ پھڑانے لگے۔

تروینی کی قدر و قیمت تیسرے مصرعے کی بدولت ہوئی جو پہلے شعر کے معمولی اور کم اثر مضمون کو بالکل نئی زندگی دیتی ہے۔ ہر قسم کی پیکر سازی تروینی کی جمالیات میں اضافہ کر سکتی ہے۔

○

کوئی صورت بھی مجھے پوری نظر آتی نہیں
آنکھ کے شیشے مرے چٹخے ہوئے ہیں کب سے

ٹکڑوں ٹکڑوں میں سبھی لوگ ملے ہیں مجھ کو

اچھی شاعری کی علامت یہ بھی ہے کہ مضمون نگاری استعارات، علامات اور اشارات میں کی جائے۔ مشہور ہے ''برہنہ حرف نگفتن ہنر گویائیست''، یعنی شاعری کا ہنر عریاں طریقہ سے نہ کہنا ہے، مطالب کو تہہ داری، گہرائی، اور رمز و رموز میں بیان کرنا قادرالکلامی اور شعری حسن آفرینی ہے۔

اس تروینی میں شاعر نے مصرعہ دوم کو محور بنایا ہے۔ آنکھ کے شیشے دراصل شاعر کی زندگی کی پیکر تراشی ہے جو بگڑے یا چٹخ چکے ہیں۔ یعنی مدت سے شاعر کی زندگی

کے خدوخال گردش میں ہیں جس کی وجہ سے احساس بھی بگڑے ہوئے ہیں اوراس کی اس حالت سے لوگ گریز اور کنارہ کشی کررہے ہیں۔اور ہر شخص صرف اس ایک پہلو کی جلوہ نمائی کرتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے کہ نمودار ہو یعنی لوگ مطلب پرست ہیں سب مجھ ہی سے فیض اور نفع اٹھانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میرا کیا حال ہے۔

اس تروینی میں شاعر نے چٹخے ہوئے عینک کے شیشوں سے مضمون نگاری کی یعنی جب دل ٹوٹا ہو جب قسمت کھوٹی ہو، جب زندگی روٹھی ہو تو کوئی چیز بھی مکمل اور صحیح نہیں ملتی۔ یہ گردش فلک ہے اور یہ زمانے کی ریت۔اس تروینی کا مضمون نادر، تجربہ گہرا، اوراثر شدید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان سے انسان کی ملاقات دلوں کی ملاقات نہیں بلکہ مصلحتوں کی بازی گری ہے۔ یہ ملمع سازی ہے اسی لیے تو دلوں کے شیشے بھی چٹخے ہوئے ہیں، دل کے شیشے میں جو بال آجائے تو وہ عشق کا وبال ثابت ہوتا ہے۔

اس تروینی میں صنعت مراعات النظیر میں صورت، آنکھ، نظر، صنعت تکرار میں ٹکڑوں ٹکڑوں، اور صنعت تضاد میں پوری، ٹکڑے، کوئی، سبھی وغیرہ بھی شامل ہیں۔

○

تیری صورت جو بھری رہتی ہے آنکھوں میں سدا
اجنبی لوگ بھی پہچانے سے لگتے ہیں مجھے

تیرے رشتے میں تو دنیا ہی پرولی میں نے

سیدھی سادی عشقیہ تروینی ہے جہاں عاشق کی پہچان معشوق کے سبب ہے۔

کیونکہ وہ فنا فی المعشوق کی منزلوں پر گامزن ہے۔ امیر خسرؔو کہتے ہیں تو مجھ جیسا ہو گیا اور میں تجھ جیسا۔ تو میری جان بن گیا اور میں تیرا جسم۔ اس لیے اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تجھ اور مجھ میں کچھ فرق باقی ہے:

تو من شدی من تو شدم تو جاں شدی من تن شدم
تا کس نگوید بعد ازین تو دیگری من دیگرم

یہاں شاعر نے نیا مضمون نکالا ہے کہ تیری صورت جو میری آنکھوں میں بھری ہے تو مجھے کنج عزلت میں جس کسی نامعلوم شخص کو دیکھتا ہوں تو آشنا معلوم ہوتا ہے یعنی تیری آشنائی بہت ہے تیری شہرت اور ملاقات ساری دنیا سے معلوم ہوتی ہے یہاں رقیبوں کی کثرت ہے ہر ایک مجھ سے کسی قسم کا رشتہ رکھ رہا ہے کیونکہ وہ سب تجھ سے جڑے ہوئے ہیں۔

قتیؔل شفائی کا شعر ہے:

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

اس شعر میں رقابت اور حسد کا جذبہ ظاہر ہے لیکن اس تروینی کا کمال یہ ہے کہ یہ آگ زیر خاکستر کی طرح پوشیدہ ہے ورنہ شاعر یہ نہ کہتا کہ تجھ سے رشتہ کرنا سارے جگ سے رشتہ ہے۔ ہر ایک تجھ سے نسبت یا آشنائی رکھتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں صنعت ایہام عمدگی سی برتی گئی ہے۔ یعنی ایک معنی یہ رشتہ جو قرب اور رشتہ داری سے قائم رہتا ہے اور دوسرے معنی میں وہ جو دھاگا جس میں دانے پروئے جاتے ہیں جو بھی رشتے کے معنی لیں معنی مکمل طور پر ظاہر ہیں۔ تیسرے مصرعے نے مضمون کو

وسعت بھی دی ہے۔

○

تم ایک بوند ہو گر کے گھٹا سے پتے پر
سمجھ رہے ہو کہ جنگل تو گونج اٹھا ہوگا

گرجتے بادلوں سے بھی یہاں تو پر نہیں ہلتا

یہ انسانی فکر کا المیہ ہے جو انا کے لہو سے پلتا ہے۔ یہاں معمولی سی شخصیت بھی خود کو عظیم ہستی مانتی ہے۔ اسی لیے دنیا کی تاریخ میں ثبت ہے کہ ایک بوالہوس کی سیہ کاری نے شہروں کو خاکستر کر دیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ خود شناسی، جہان شناسی اور خدا شناسی کا دروازہ ہے جہاں قطرے میں دریا کی حقیقت اور ماہیت کو بتایا گیا ہے۔ ایک عمدہ فارسی شعر ہے کہ یہ خیال مت کر اگر تو مر جائے گا تو دنیا ختم ہو جائے گی، بلکہ ہزاروں شمعیں جل کر راکھ ہو گئیں پھر بھی محفل جاری ہے:

گماں مبر کہ در تو بگذشت جہاں بگذشت
ہزار شمع را کشتند و محفل باقیست

بڑے بڑے سورما دنیا سے خالی ہاتھ بے بس اور بے کسی میں چلے گئے۔ یہاں انسان کو اس کی ارزش سے واقف کیا جا رہا ہے اور اس میں عبرت کا بھی درس شامل ہے۔ پوری تزوینی صنعت مراعات النظیر یعنی بوند، گھٹا، گرجتے، بادلوں پر تعمیر کی گئی ہے۔ تینوں مصرعوں میں ''گ'' کی تکرار گر، گھٹا، گونج، گرجتے وغیرہ نے نغمگی کو بڑھا دیا ہے۔ یہاں محاورہ ''پر نہیں ہلتا'' خوبصورت مقام پر باندھا گیا ہے۔

○

سب پہ آتی ہے سب کی باری ہے
موت انصاف کی نشانی ہے

زندگی سب پہ کیوں نہیں ہے

بڑی خوبصورت ترو ینی ہے۔اس کا پہلا شعر خود عمدہ کامل شعر ہے۔آج تک دنیا میں کوئی شخص ایسا پیدا نہ ہوا جس نے موت سے انکار کیا ہو۔دنیا میں ہر شے سب پر لاگو نہیں، ہر ایک قانون میں کچھ کچھ استثنا موجود ہے۔صرف موت ہی ایسی چیز ہے جس کا فرمان اور عمل سو فیصدی ہے، ہر چیز فانی ہے اور یہی موت کا انصاف ہے کہ ہر ایک پر آتی ہے۔شاعر نے مصرعے دوم میں موت کو انصاف کی علامت قرار دیا ہے جو بالکل صحیح ہے ۔موت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی منصف نہیں۔

ترو ینی کا ایک خاص منصب اس کے معنی کو بدل دینا بھی ہے جسے یہاں پہلے کے شعر کے مطلب کو تیسرے مصرع نے دھندلا کر دیا اور ایک جذباتی اور کیفیتی سوال اٹھایا کہ موت کی ضد جو زندگی ہے کیوں سب کو نصیب نہیں ہوتی یعنی یوں تو سب زندہ ہیں لیکن زندگی زندگی میں فرق ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض زندوں پر کبھی زندگی نہیں آتی۔ یہاں دنیا میں سب کچھ ہے لیکن انصاف نہیں ہے اور شاید اسی لیے کہتے ہیں۔ World is not fair یہ ترو ینی الفاظ کی تکرار جیسے سب، اور ہے کی وجہ سے مترنم ہو گئی ہے۔

صنعت تضاد نے زندگی اور موت کو جمع کر دیا ہے۔ تیسرے مصرعے نے

معاشرے مُلک، عوام، حکمران اور حالات کو جھنجھوڑا ہے۔ انسانی حقوق کی گفتگو شاعری کو بڑی شاعری اور پیامبری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس تروینی میں مختلف صنعتیں خود بخود جمع ہوگئی ہیں جیسے مصرعۂ اول اور مصرعۂ آخر میں آتی اور نہیں آتی وغیرہ۔

○

زندگی کیا ہے جاننے کے لیے
زندہ رہنا بہت ضروری ہے

آج تک کوئی بھی رہا تو نہیں

یہاں پھر شاعر نے زندگی سے بحث کی ہے۔ اردو شعرا نے زندگی کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کو اگر جمع کریں تو دفتر بن سکتا ہے مگر پھر بھی زندگی کا مطلب ادھورا ہی رہے گا۔ کسی نے کہا:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

چکبستؔ نے کہا:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی جزا کا پریشاں ہونا

گلزارؔ نے زندگی کے مسئلہ کو سہل ممتنع سے حل کر دیا کہ زندگی جاننے کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے بعد سوال اٹھایا کہ اس فانی دنیا میں کوئی بھیتو

زندہ نہیں رہا۔ یہاں صنعت ابہام اور ایہام میں گفتگو ہے۔ ایک سیدھے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کی زندگی فانی ہے اور کوئی بھی ہمیشہ زندہ نہ رہا جو زندگی کی تعریف کر سکتا اور دوسرے یہ کہ جسے لوگ زندگی سمجھ کر گزار رہے ہیں یہ زندگی نہیں۔ جس پہلو سے دیکھیں معانی درستی ہیں۔ ایسے مطالب شاعری کے فلسفے کے اشعار میں بحث کیے جاسکتے ہیں یا ہر قسم کے مطالب میں بھی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ پوری تروینی بات چیت کی طرح ہے کہیں مصرعہ بیانیہ ہے کہیں سوالیہ لیکن سیدھا سادہ۔

○

ایک بار خودکشی کی کوشش تھی
موت کا ڈر نکل گیا تھا دل سے

زندہ رہنے کا ڈر نہیں جاتا

پھر اس تروینی میں موت اور زندگی کے مسائل ہیں۔ انسانی نفسیات اور Psychic میں موت کو اگر مسلسل سوچا جائے اور موت کے بعد کی زندگی کے تصور کو مسلسل اپنایا جائے تو موت کا خوف کم ہو جاتا ہے۔ انسان جب اپنی زندگی ختم کرنے کی ٹھان لیتا ہے جسے عام زبان میں خودکشی کہتے ہیں اُس کو موت کا خوف نہیں رہتا یا خوف کے سوچنے کے احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔ خودکشی آج کے دور کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ شاعر نے اس تروینی میں خودکشی کے ایک پہلو خوف نہ ہونے پر زور دے کر ندرت بیانی کی ہے۔ شاعر یہ بتا رہا ہے کہ موت اور زندگی دونوں کا ڈر انسان کو رہتا ہے اور زندگی کا خوف موت کے خوف سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ جو شخص

خودکشی کر کے بچ گیا، اس کے پاس موت کا خوف تو نہیں مگر زندہ رہنے کا خوف باقی ہے۔ گلزار یہاں ہمیں گلاس میں آدھا حصہ خالی دکھا رہے ہیں جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس تروینی میں صنعت مراعات النظیر میں زندہ، موت، خودکشی کے علاوہ تضاد الفاظ موت، زندہ شامل ہیں۔ ایسی تروینیاں گیرائی کے ساتھ گہرائی کی حامل ہیں۔

موت اور زندگی، جینا اور مرنا، گلزار کی شاعری میں مختلف جہتوں سے پیش کیے گئے ہیں۔ مگر ہر مقام پر کم وبیش مطلب اور معانی دوسرے ہیں۔ یعنی گلزار ان الفاظ سے موضوع کے مطابق پیکر تراشی کرتے ہیں اور اس عمل سے ترسیل اور ابلاغ میں فرق نہیں پڑتا۔ آیئے ایک اور تروینی دیکھیے:

○

موت کے بعد بہت لوگوں نے زندہ رکھّا
زندہ تھا جب تک لوگوں نے مارا اس کو

ہاں منٹو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا

اس تروینی میں موت اور زندگی کو دوسرے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ زندہ رہنا صرف سانس کے اُتار چڑھاؤ پر منحصر نہیں بلکہ انسان اپنے ہنر، کارناموں اور کاموں کی بدولت صدیوں زندہ رہتا ہے جسے عام فہم میں زندۂ جاوید کہتے ہیں۔ اسی کی طرف ذوقؔ نے بھی اشارہ کیا ہے:

ع: رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ

جوشؔ نے اپنی ایک نظم میں برصغیر کی تہذیب اور ہنرمندوں کی ناقدری پر کہا ہے کہ جب تک ہنرمند زندہ رہتا ہے اُسے تکلیف اور اذیتیں دیتے ہیں لیکن اس کے مرنے کے بعد خوبصورت اس کی سنگ مرمر کی قبر بنا دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال کو بھی ان کی حیات میں زحمت دی گئی۔ان کی قدر نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے لیکن آج بہت لوگ ان کی تصویر کا لیبل اپنے کوٹ اور ان کی تصویر اپنے آفس میں رکھتے ہیں۔ اگر فہرست بنائی جائے تو درجنوں ایسی ہستیاں ہوں گی جن سے زمانے نے انصاف نہ کیا۔ جہاں تک منٹو کا تعلق ہے افسوس اس کا ہے کہ ان کے ہنر کی قدر عوام نے کی مگر اس کی قیمت ادا نہ ہوئی وہ مشکل سے اپنے گھر کا کاروبار چلاتے ہیں لیکن ان کے ہنر سے دوسرے لوگ ماڈی اور فنی فائدہ اٹھاتے رہے اور اٹھا رہے ہیں۔

○

اگلا پل جینے کے لیے
پچھلے پل کو وداع تو کرلو

کل جو گیا وہ گیا نہیں ہے

عمدہ ترویج ہے۔ وقت کا دھار کل آج اور کل میں بانٹا جاتا ہے جس سے دنیا کے کاروبار چلتے ہیں۔ یہاں لمحہ یا پل درحقیقت ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم ہوتا ہے۔ حال کا وجود خود خطرے میں ہے کیوں کہ ہر لحظہ وہ ماضی کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔ روایت کا تعلق ماضی سے ہے جدیدیت کا تعلق مستقبل سے ہے اور اس کے

درمیان حال ہے۔گلزار ماضی سے تجربے، تہذیب، تربیت ،تعلیم اور تاریخ سے منسلک رہنا چاہتے ہیں کیونکہ یہی قدریں ہیں جن سے ہم مستقبل میں عزت کی زندگی جی سکیں گے۔مصرعہ دوم میں وداع کا لفظ،یعنی رخصت ہوتے وقت گلے مل لو ایک رابطہ برقرار رکھو کیوں کہ جو کل گیا ہے وہ اپنے مقام پر موجود ہے۔شاعر اس تروینی میں یہ تاکید کر رہا ہے کہ روایت سے جوڑ ضروری ہے یہی جوڑ زندگی گزارنے کا سرمایہ ہے۔روایت گزر کر بھی گزرتی نہیں بلکہ قائم رہتی ہے۔

یہاں چھوٹی بحر میں الفاظ کی تکرار پل، پل۔گیا گیا، کے علاوہ تضاد کے الفاظ اگلا، پچھلے۔نہیں، ہے، شامل ہیں۔تیسرے مصرعے کی کرشمہ سازی مصرعوں کو نئے معنی عطا کرتی ہے۔ویسے دیکھنے میں آسان اور سہل تروینی معلوم ہوتی ہے۔لیکن غور کرنے پر اس کی تہہ داری اور وسعت کا بیان معلوم ہوتا ہے۔اس مختصر تجزیے کے آخر میں ایک طنزیہ تروینی اردو ہندی زبان کے مسئلے پر پیش کرتے ہیں۔

○

وہ دونوں دعویدار تھے اپنی زبان کے
اُردو تری زباں نہیں، ہندی مری نہیں

دو بے ادب کو انگریزی میں لڑتے ہوئے دیکھے!

برصغیر میں زبان کا مسئلہ جذباتی ہونے کی وجہ سے عالم اور عامی دونوں اس جھگڑے میں ملوث ہے۔گذشتہ ایک صدی سے سیاسی مذہبی اور خصوصی مفادات کی خاطر اردو ہندی مسئلے کو مشتعل کیا جا رہا ہے یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

ایسے پُرآشوب دور میں گلزار صاحب کی تروینی طنزیہ ہوتے ہوئے سچائی کی نقیب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلے کو آب وتاب وہ لوگ دے رہے ہیں جنھیں دونوں زبانوں سے سروکار نہیں۔ اردو، ہندی دونوں برصغیر کی زبانیں ہیں، زیادہ تر بول اور الفاظ مشترک ہیں۔ رسم الخط اور شاعری کے فن میں الگ الگ راہیں ہیں لیکن ایک دوسرے سے نبرد آزما نہیں۔ برصغیر میں چوبیس (۲۴) سے زیادہ زبانیں موجود ہیں۔ یہ زبانیں تہذیبی، تربیتی، ثقافتی اور علمی طور پر ایک دوسرے سے کچھ حاصل کرتی ہیں۔ کوئی بھی زبان کسی کی میراث نہیں۔ ہر شخص کسی بھی زبان کو اپنا سکتا ہے۔ اردو ہندی کے دعویدار عام طور پر وہی ہیں جنھیں دونوں زبانیں نہیں آتیں ان کو ادب سے کوئی سروکار نہیں۔ تیسرے مصرعے نے یہاں طنزیہ طور پر بتادیا کہ وہ جو اردو ہندی کے دعویدار تھے خود ان زبانوں میں بات نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک خارجی زبان انگریزی میں لڑ رہے تھے۔ یہاں زبان کی تکرار، تری، مری کا تضاد اور بے ادب کا تیسرے مصرع میں وجود تروینی کو نرم سلیس اور پُرکار بنا دیتا ہے۔

☆☆☆

تروینیاں

۱

ہاتھ ملا کر دیکھا اور کچھ سوچ کے میرا نام لیا
جیسے یہ سرورق کسی ناول پہ پہلے دیکھا ہے

رشتے کچھ بس بند کتابوں میں ہی اچھے لگتے ہیں

۲

سامنے آئے مرے دیکھا مجھے بات بھی کی
مسکرائے بھی پرانی کسی پہچان کی خاطر

کل کا اخبار تھا بس دیکھ لیا رکھ بھی دیا

۳

شعلہ سا گذرتا ہے مرے جسم سے ہوکر
کس لو سے اتارا ہے خداوند نے تم کو

تنکوں کا مرا گھر ہے کبھی آؤ تو کیا ہو

۴

کوئی چادر کی طرح کھینچے چلا جاتا ہے دریا
کون سویا ہے تلے اس کے جسے ڈھونڈ رہے ہیں

ڈوبنے والے کو بھی چین سے سونے نہیں دیتے

۵

اڑ کے جاتے ہوئے پنچھی نے بس اتنا دیکھا
دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی شاخ فضا میں

الوداع کہنے کو یا پاس بلانے کے لیے

٦

سب پہ آتی ہے سب کی باری ہے
موت انصاف کی علامت ہے

زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی

۷

خیال پھینکا ہے رفتار بے پناہ کے ساتھ
خدا کو پہنچے کہ اس سے پرے نکل جائے

کہ اُس کے بعد جو پہنچا تو مجھ تک آئے گا

۸

کیا پتہ کتنی بار مارے گی
میں تو بس زندگی سے ڈرتا ہوں

موت تو ایک بار مارے گی

۹

رات کے پیڑ پہ کل ہی تو اُسے دیکھا تھا
چاند بس گرنے ہی والا تھا پکے پھل کی طرح

سورج آیا ہے ذرا اس کی تلاشی لینا

۱۰

بھیگا بھیگا سا کیوں ہے یہ اخبار
اپنے ہاکر کو کل سے چینج کرو

پانچ سو گاؤں بہہ گئے اس سال

۱۱

شام گزری ہے بہت پاس سے ہوکر لیکن
سر پہ منڈلاتی ہوئی رات سے جی ڈرتا ہے

سر چڑھے دن کی اسی بات سے جی ڈرتا ہے

۱۲

زلف میں یوں چمک رہی ہے بوند
جیسے بیری میں تنہا اک جگنو

کیا بُرا ہے جو چھت ٹپکتی ہے

۱۳

نہ ہر سحر کا وہ جھگڑا نہ شب کی بے چینی
نہ چولھا جلتا ہے گھر میں نہ آنکھیں جلتی ہیں

میں کتنے امن سے گھر میں اداس رہتا ہوں

۱۴

کچھ خوابوں کے خط ان میں، کچھ چاند کے آئینے، سورج کی شعاعیں ہیں
شعروں کے لفافے ہیں، کچھ تجربے ہیں میرے، کچھ میری دعائیں ہیں

نکلو گے سفر پر جب یہ ساتھ میں لے لینا شاید کہیں کام آئیں

۱۵

ستارے، چاند کی کشتی میں رات لاتی ہے
سحر کے آنے سے پہلے ہی بِک بھی جاتے ہیں

بہت ہی اچھا ہے بیوپار ان دِنوں شب کا!

۱۶

بس ایک پانی کی آواز، لپلپاتی ہے
کہ گھاٹ چھوڑ کے مانجھی تمام جا بھی چکے

چلو نا! چاند کی کشتی میں جھیل پار کریں

۱۷

زمین اُس کی، زمیں کی یہ نعمتیں اُس کی
یہ سب اُسی کا ہے، گھر بھی، یہ گھر کے بندے ہیں

خدا سے کہیے کبھی وہ بھی اپنے گھر آئے

۱۸

اک نوالے سی نگل جاتی ہے یہ نیند مجھے
ریشمی موزے نگل جاتے ہیں پاؤں جیسے

صبح لگتا ہے کہ تابوت سے نکلا ہوں ابھی

۱۹

کاش آئے کوئی، شاعر کی سنے
شعر کے درد سے مرجائے گا!

چاندنی پھانک رہا تھا شب بھر!!

۲۰

کچھ انتظار میں، کچھ ہجر، کچھ وصال میں تھے
بہت سے لوگ تھے کل رات چاند کشتی میں

مگر سحر کی کسی کو بھی آرزو ہی نہ تھی!

۲۱

عمر کے کھیل میں اک طرفہ ہے یہ رسّہ کشی
اک سِرا مجھ کو دیا ہوتا، تو اک بات بھی تھی

مجھ سے تگڑا بھی ہے، اور سامنے آتا بھی نہیں

۲۲

خفا رہے وہ ہمیشہ تو کچھ نہیں ہوتا
کبھی کبھی جو ملے، آنکھیں پھوٹ پڑتی ہیں

بتائیں کس کو، بہاروں میں درد ہوتا ہے

۲۳

لوگ میلوں میں بھی گم ہوکر ملے ہیں بارہا
داستانوں کے کسی دلچسپ سے اک موڑ پر

یوں ہمیشہ کے لیے بھی کیا بچھڑتا ہے کوئی؟

۲۴

آپ کی خاطر اگر ہم لُوٹ بھی لیں آسماں
کیا ملے گا چند چمکیلے سے شیشے توڑ کے!

چاند چُبھ جائے گا اُنگلی میں تو خون آجائے گا

۲۵

پَو پھوٹی ہے اور کرنوں سے کانچ بجے ہیں
گھر جانے کا وقت ہوا ہے پانچ بجے ہیں

ساری شب گھڑیال نے چوکیداری کی ہے!!

۲۶

اس سے پہلے، رات مرے گھر چھاپا مارے
میں تنہائی تالے میں بند کر آتا ہوں

''گربا'' ناچتا ہوں پھر گھومتی سڑکوں پر!!

۲۷

رات، پریشاں سڑکوں پر اک ڈولتا سایہ
کھمبے سے ٹکرا کے گرا اور فوت ہوا!

تاریکی کی ناجائز اولاد تھی کوئی!

۲۸

بے لگام اڑتی ہیں کچھ خواہشیں ایسے دل میں
''میکسیکن'' فلموں میں کچھ دوڑتے گھوڑے جیسے

تھان پر باندھی نہیں جاتیں، سبھی خواہشیں مجھ سے!

۲۹

کبھی کبھی بازار میں یوں بھی ہو جاتا ہے
قیمت ٹھیک تھی، جیب میں اتنے دام نہیں تھے

ایسے ہی اک بار مَیں ، تم کو ہار آیا تھا!

۳۰

نہ ہم مڑے، نہ کہیں راستہ مڑا اپنا
نشیب آئے کہیں، اور کہیں فراز آئے

میں نیچے نیچے چلا، تم بلندیوں پہ رہیں!

۳۱

وہ میرے ساتھ ہی تھا دور تک، مگر اک دن
جو مڑ کے دیکھا تو وہ دوست میرے ساتھ نہ تھا

پھٹی ہو جیب تو کچھ سکّے کھو بھی جاتے ہیں

۳۲

کچھ مِرے یار تھے رہتے تھے مرے ساتھ ہمیشہ
کوئی آیا تھا، انھیں لے کے گیا، پھر نہیں لَوٹے

شیلف سے نکلی کتابوں کی جگہ خالی پڑی ہے

۳۳

اِتنی لمبی انگڑائی لی لڑکی نے
شعلے جیسے سورج پر جا ہاتھ لگا

چھالے جیسا چاند پڑا ہے اُنگلی پر

۳۴

بڑبڑ کرتے لفظوں کو چمٹی سے پکڑو
پھینکو اور مسل دو، پَیر کی ایڑی سے

افواہوں کو خوں پینے کی عادت ہے

۳۵

پرچیاں بٹ رہی ہیں گلیوں میں
اپنے قاتل کا انتخاب کرو

وقت یہ سخت ہے چناؤ کا

۳۶

چوڑی کے ٹکڑے تھے، چبھتے ہی خوں بہہ نکلا
ننگے پاؤں کھیل رہا تھا، لڑکا گھر کے آنگن میں

باپ نے کل پھر دارُو پی کے، ماں کی بانہہ مروڑی تھی

۳۷

زمین گھومتی ہے گِرد آفتاب کے
زمیں کے گِرد گھومتا ہے چاند رات دن

ہیں تین ہم! ہماری فیملی ہے تین کی

۳۸

کچھ آفتاب اور اُڑے کائنات میں
میں آسمان کی جٹائیں کھول رہا تھا!

وہ تولیے سے گیلے بال چھانٹ رہی تھی!

۳۹

جنگل سے گزرتے تھے تو کبھی بستی بھی مل جاتی تھی
اب بستی میں کوئی پیڑ نظر آ جائے تو جی بھر آتا ہے

دیوار پہ سبزہ دیکھ کے اب، یاد آتا ہے پہلے جنگل تھا!

۴۰

جاتے جاتے ایک بار تو کار کی بتی سرخ ہوئی
شاید تم نے سوچا ہو کہ رُک جاؤ، یا لوٹ آؤ

سگنل توڑ کے لیکن تم اک دوسری جانب گھوم گئے!

۴۱

پیڑوں کے کٹنے سے ناراض ہوئے ہیں شاید
دانہ چگنے بھی نہیں آتے مکانوں پہ پرندے

کوئی بلبل بھی نہیں بیٹھتی اب شعر پہ آکر

۴۲

ذرا ''پیلیٹ'' سنبھالو رنگ و بو کا
میں کینوس آسماں کا کھولتا ہوں

بناؤ پھر سے صورت آدمی کی

(۴۳)

جس سے بھی پوچھا ٹھکانا اس کا
اک پتہ اَور بتا جاتا ہے

یا وہ بے گھر ہے، یا ہرجائی ہے

(۴۴)

کیا بتلائیں؟ کیسے یاد کی موت ہوئی
ڈوب کے پانی میں پرچھائیں فوت ہوئی

ٹھہرے پانی کتنے گہرے ہوتے ہیں

۴۵

کون کھائے گا؟ کس کا حصّہ ہے؟
دانے دانے پہ نام لکھّا ہے

سودچند، مُولچند، اور جیٹھا!

۴۶

اِتنے لوگوں میں کہہ دو آنکھوں سے
اتنا اونچا نہ ایسے بولا کریں

سب مرا نام جان جاتے ہیں!

۴۷

ماں نے جس چاند سی دُلہن کی دعائیں دی تھیں
آج کی رات وہ فٹ پاتھ سے دیکھا میں نے!

رات بھر روٹی نظر آیا ہے وہ چاند مجھے!

۴۸

سارا دن بیٹھا، مَیں ہاتھ میں لے کر خالی کاسہ
رات جو گزری، چاند کی کوڑی ڈال گئی اس میں

سود خور سورج کل مجھ سے یہ بھی لے جائے گا

۴۹

آؤ سارے پہن لیں آئینے
سارے دیکھیں گے اپنا ہی چہرہ

سب کو سارے حسیں لگیں گے یہاں

۵۰

کہیں مٹّی اُچھلتی ہے، کہیں کنکر چھٹکتا ہے
کہ ٹُھڈّے مارتی چلتی ہیں راہوں میں ہوائیں

عجب لڑکوں سے لگتی ہیں یہ دوشیزہ ادائیں!

۵۱

تمام صفحے کتابوں کے پھڑپھڑانے لگے
ہَوا دھکیل کے دروازہ آگئی گھر میں

کبھی ہَوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو!

۵۲

وہ جس سے سانس کا رِشتہ بندھا ہُوا تھا مرا
دبا کے دانت تلے، سانس کاٹ دی اس نے

کٹی پتنگ کا مانجا محلے بھر میں لٹا!

۵۳

زہریلے مچھر مارو آوازوں کے
سوُجن ہوجاتی ہے ان کے کاٹے سے

مچھر دانی تان کے جینا مشکل ہے!

۵۴

اس تیز دھوپ میں بھی اکیلا نہیں تھا میں
اک سایہ میرے دونوں طرف دوڑتا رہا

تنہا ترے خیال نے رہنے نہیں دیا!

۵۵

کوئی صورت بھی مجھے پوری نظر آتی نہیں
آنکھ کے شیشے مرے چٹخے ہوئے ہیں کب سے

ٹکڑوں ٹکڑوں میں سبھی لوگ ملے ہیں مجھ کو

۵۶

تیری صورت جو بھری رہتی ہے آنکھوں میں سدا
اجنبی لوگ بھی پہچانے سے لگتے ہیں مجھے

تیرے رشتے میں تو دنیا ہی پرولی میں نے

۵۷

ایک سے گھر ہیں سبھی ایک سے باشندے ہیں
اجنبی شہر میں کچھ اجنبی لگتا ہی نہیں

ایک سے درد ہیں سب، ایک سے ہی رشتے ہیں

۵۸

چاند کے ماتھے پر بچپن کی چوٹ کے داغ نظر آتے ہیں
روڑے، پتھر اور غلّوں سے دن بھر کھیلا کرتا تھا

بہت کہا آوارہ اُلکاؤں کی سنگت ٹھیک نہیں

۵۹

چھو کے فانوس گزرتی ہے صبا جب گھر سے
تیری آواز کے چھینٹے سے چھڑک جاتی ہے

گدگدانے سے تو ایسے ہی ہنسا کرتی ہے

ایک اک یاد اٹھاؤ اور پلکوں سے پونچھ کے واپس رکھ دو
اشک نہیں یہ آنکھ میں رکھے، قیمتی شیشے ہیں

طاق سے گر کے قیمتی چیزیں ٹوٹ بھی جایا کرتی ہیں

٦١

زندگی کیا ہے جاننے کے لیے
زندہ رہنا بہت ضروری ہے

آج تک کوئی بھی رہا تو نہیں

٦٢

ایسے بکھرے ہیں رات دن جیسے
موتیوں والا ہار ٹوٹ گیا

تم نے مجھ کو پرو کے رکھا تھا

۶۳

دریا جب اپنے پانی کھنگالتے ہیں طغیانی میں
جتنا کچھ ملتا ہے وہ سب ساحل پر رکھ جاتے ہیں

لے جاتے ہیں، گرم جو لوگوں نے پھینکے ہوں دریا میں

۶۴

ہے نہیں جو دکھائی دیتا ہے
آئینے پر چھُپا ہوا چہرہ

ترجمہ آئینے کا ٹھیک نہیں

۶۵

ایسے آئی ہے تری یاد اچانک
جیسے پگڈنڈی کوئی پیڑوں سے نکلے

اک گھنے ماضی کے جنگل میں ملی ہو

۶۶

یہ سُست دھوپ ابھی نیچے بھی نہیں اُتری
یہ سردیوں میں بہت دیر چھت پہ سوتی ہے

لحاف امید کا بھی کب سے تار تار ہوا

٦٧

اِتنے عرصے بعد ہینگر سے کوٹ نکالا
کتنا لمبا بال ملا ہے کالر پر

پچھلے جاڑوں میں پہنا تھا، یاد آتا ہے

٦٨

کھڑکیاں بند ہیں، دروازوں پہ بھی تالے ہیں
کیسے یہ خواب چلے آتے ہیں پھر کمرے میں

نیند میں کوئی تو روزن ہے کھُلا رہتا ہے

٦٩

تیرے شہر پہنچ تو جاتا
رستے میں دریا پڑتے ہیں

پُل سب تو نے جلا دیے تھے

٧٠

تمھارے ہونٹ بہت خشک رہتے ہیں
اُنھی لبوں پہ کبھی تازہ شعر ملتے تھے

یہ تم نے ہونٹوں پہ افسانے رکھ لیے کب سے

۷۱

کونے والی سیٹ پہ اب دو اور ہی کوئی بیٹھتے ہیں
پچھلے چند مہینوں سے، اب وہ بھی لڑتے رہتے ہیں

کلرک ہیں دونوں، لگتا ہے اب شادی کرنے والے ہیں

۷۲

میں بس میں بیٹھا ہوا ڈھونڈنے لگا مڑ کے
نہ جانے کیوں یہ لگا، تم وہیں کہیں پر ہو

تمھارا سینٹ، کسی اور نے لگایا تھا

۷۳

کچھ اس طرح خیال ترا جل اٹھا کہ بس
جیسے دیا سلائی جلی ہو اندھیرے میں

اب پھونک بھی دو، ورنہ یہ انگلی جلائے گا

۷۴

بس دن ڈھلا کہ آلے میں اک چہرہ جل اُٹھا
اک تازہ زخم کی سی وہاں روشنی ہوئی

اور جلتی شمعوں سے کئی قطرے پگھل گئے

۷۵

کانٹے والی تار پہ کس نے گیلے کپڑے ٹانگے ہیں
خون ٹپکتا رہتا ہے اور نالی میں بہہ جاتا ہے

کیوں اس فوجی کی بیوہ ہر روز یہ وردی دھوتی ہے

۷۶

ہل واہا تھا ہوری نے اور زمیندار کے کھیت ہوئے
غلّہ بیچا بنیے نے، اور داتا کی تعریف ہوئی

مٹّی کی گودی پھر خالی، جس نے کھیت اُگائے تھے

۷۷

آؤ زبانیں بانٹ لیں، اب اپنی اپنی ہم
تم کب سنو گے بات، نہ ہم کو سمجھنا ہے

دو اَن پڑھوں کو کتنی محبت ادب سے ہے

۷۸

ساری وادی اداس بیٹھی ہے
موسمِ گل نے خود کشی کر لی

''مائنیز'' پر پاؤں رکھ دیا اس نے

۷۹

ناپ کے، وقت بھرا جاتا ہے ہر ’’ریت گھڑی‘‘ میں
اک طرف خالی ہو جب، پھر سے اُلٹ دیتے ہیں اُس کو

عمر جب ختم ہو، کیا مجھ کو وہ اُلٹا نہیں سکتا؟

۸۰

چڑیاں اڑتی ہیں مرے کانچ کے دروازے کے باہر
ناچتی دھوپ کی چنگاریوں میں جان بھری ہے

اور مَیں چِتا کا تودہ ہوں، جو کمرے میں پڑا ہے

۸۱

پتھر کی دیوار پہ، لکڑی کے اک فریم میں، کانچ کے اندر پھول بنے ہیں
ایک تصور خوشبو کا، اور کتنے سارے پہناوؤں میں بند کیا ہے

عشق پہ دل کا ایک لباس ہی کافی تھا، اب کتنی پوشاکیں پہنے گا؟

۸۲

یہ آدھا چاند کالے آسماں اوپر
اندھیرا چاٹتی ہے جیبھ سے حبشن

کڑھائی صبح تک چٹ کر کے جاتی ہے

۸۳

ایک تمبو لگا ہے سرکس کا
بازی گر جھولتے ہی رہتے ہیں

ذہن خالی کبھی نہیں ہوتا!

۸۴

چلوناں، شور میں بیٹھیں جہاں کچھ نہ سنائی دے
کہ اس خاموشی میں تو سوچ بھی بجتی ہے کانوں میں

بہت بتیایا کرتی ہے یہ چھاپے کٹنی تنہائی!

۸۵

کروٹ لے کر جب یہ پل، اس جگہ سے لڑھکے گا
دوسرا پل کروٹ لے کر اس جگہ پہ آئے گا

کروٹ لیتے پلوں پہ صدیاں زندہ رہتی ہیں

۸۶

اگلا پل جینے کے لیے
پچھلے پل کو وداع تو کرلو!

کل جو گیا، وہ گیا نہیں ہے

۸۷

دیر تک آسماں پہ اڑتے رہے
اک پرندے کے بال و پَر سارے

باز اپنا شکار لے کے گیا

۸۸

منوں کا بوجھ لے کر چل رہے ہو
بہت بھاری ہے بوجھا لے کے چلنا

اُمیدیں کم کرو لمبا سفر ہے!

۸۹

روز یہی لگتا ہے کل کے دن امید بَر آئے گی
شام ہوتے ہوتے لیکن پھر دن کا حمل ِگر جاتا ہے!

روز شفق پر، انڈے کی زردی دِکھتی ہے پھیلی ہوئی!

۹۰

ٹوٹ گیا ہے شاید رات کا چاند بٹن
آدھا ٹکڑہ کل آکاش پہ دیکھا تھا

شَنی کے پاس تو چودہ ہیں، اک دے گا کیا؟

۹۱

کوئی چپّہ نہیں چھوڑا ، کوئی کونہ نہیں چھوٹا
فلک کو رات بھر چھانا ہے میں نے، اور صبح کردی

کسی کی نتھ کا ہیرا گر پڑا تھا رات تاروں میں!

۹۲

مور اک آسماں پہ بیٹھا ہوا
رات بھر تارے چگتا رہتا ہے

کتنے سوراخ کر گیا شب میں!

۹۳

تارے دفنا کے رات بیٹھی ہے
آفتاب ایک غار میں بند ہے

قبر پر اک چراغ جلتا ہے!

۹۴

ایک اُمید دفن ہے اُس میں
رات رہتی ہے جس جزیرے پر

آفتاب ایک غار میں بند ہے!!

۹۵

سب کو سُلا کے میرے پاس آن بیٹھی ہے
اس رات کا بھی اور نہیں کوئی، جو سُنے!

ہوتے ہوتے داستاں بھی بوڑھی ہوگئی!

۹۶

تبھی تبھی میری تھوڑی سی آنکھ لگی تھی
چاند نے جب کھڑکی پر آکر دستک دی تھی

کیا تم نے کل، کچھ کہلا کر بھیجا تھا؟

۹۷

چاند نے کل کھڑکی پر آکر دستک دی تھی
میں نے اُٹھ کر دیکھا باہر کوئی نہیں تھا

چِک پر چاندنی سے کچھ لکھ کر چلا گیا تھا!

۹۸

کل جب رات کے بال کھلے تو اُس کا "رِبن"
دور زمیں پہ جا کے گِرا لہراتا ہوا!

رات کو دیکھی "تھمپو" ندی بل کھاتی ہوئی!

۹۹

کس گھوڑے کی نال گری ہے تاروں میں
آدھی رات یہ کون گیا ہے پار فلک کے؟

عشق ہے جس کے پاؤں زمیں پر پڑتے نہیں!

۱۰۰

پردے کھینچ کے، سب دروازے بند کیے تھے
پھر بھی قید نہیں کر پایا تھا مَیں اُس کو!

سورج کو معلوم تھا رات کہاں پر بند ہے!

۱۰۱

شاخ پہ صبح سے گوریّا چہک رہی ہے
تم کو میرے گھر سے نکلتے دیکھا ہوگا

رُسوا کرنے والے اکثر اپنے ہوتے ہیں!

۱۰۲

دو ہی لوگوں کی جگہ نظم میں ہے، آجاؤ
آؤ لے چلتے ہیں افلاک گھما لائیں تمھیں!

یاد رکھّوگے کہ شاعر سے محبت کی تھی!

۱۰۳

کھلنے لگے ہیں، آسمان کے، سرے اُفق سے
کتنی جگہ سے، اب یہ خیمہ، ادھڑنے لگا ہے

سارا دن، بیٹھا نظموں سے، رفو کرتا ہوں

۱۰۴

تمھاری نظم سُن کر دوست، کٹ جاتے ہیں سینے
زباں کی دھار سے لوگوں میں فرقے بانٹ دیتے ہیں

بلا کا استرا آیا ہے اک بندر کے ہاتھ میں!

۱۰۵

ہلکے ہلکے اور سفید سے بادلوں کے اک ہالے میں
'ہاف فرائیڈ' انڈے کی طرح رکھا یہ پیلا پیلا چاند!

سارے دن میں کھانے کو اک سُوکھا ٹوسٹ بھی دیکھا نہیں!

۱۰۶

تم ایک بوند ہو، گِر کے گھٹا سے پتّے پر
سمجھ رہے ہو کہ جنگل تو گونج اُٹھا ہوگا

گرجتے بادلوں سے بھی یہاں تو پر نہیں ہلتا!

۱۰۷

تم ایک بوند ہو بھٹکے ہوئے سے بادل کی
کسی چٹان پہ گرنے سے کیا صدا ہوگی!

سمندر سر پٹختا ہے یہاں، کس نے سُنی ہے؟

۱۰۸

جتنی بار وہ کھانستا تھا لگتا تھا جیسے
پھر مالک کا بوٹ بجا دروازے پر

سود نِگل کے اُس نے آتم ہتیا کرلی!

۱۰۹

موت کے بعد بہت لوگوں نے زندہ رکھّا
زندہ تھا جب تک لوگوں نے مارا اس کو!

ہاں منٹو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا!

۱۱۰

کامریڈ کیسا زندہ لگتا ہے
ہار چڑھتا ہے روز فوٹو پر!

زندگی میں تو صرف مرتا رہا!

۱۱۱

سُنا ہے ایک شخص ہے، گلی کے موڑ پر
آج بھی وہ چین کی نیند سوتا ہے

چل کے دیکھیں تو ذرا، ہے کس زمانے کا؟

۱۱۲

بسوں، کاروں کے، ہر جانب الاؤ جل رہے ہیں
سڑک سے رقص کرتے غل مچاتے دنگے گزرے ہیں

کبھی یہ بھی تو دِکھلاؤ، 'رِپبلک ڈے' کی جھانکی میں

۱۱۳

تم نے جب خودکشی کی کوشش کی تھی
موت کا ڈر نکل گیا تھا تب دل سے

اب تمھیں زندگی سے کیا ڈر ہے!

۱۱۴

دوست نے راز ایسے فاش کیا
جُوٹھے برتن میں جیسے دودھ پھٹے

لب سے نکلی جو بات، بات گئی!!

۱۱۵

''پھول کی پتّی سے کٹ جاتے ہیں ہیرے''
آری سے کٹتی نہیں نابھی کی ناڑی

سخت، کتنے سخت ہوتے ہیں یہ رشتے!

۱۱۶

اک نو سال کا لڑکا میرے ساتھ آیا تھا
دیکھنا میری فائل میں، وہ ہے یا بھاگ گیا

کہیں کسی کاغذ کے ساتھ ہی ٹانک دیا نہ ہو!

۱۱۷

نہ کوئی چھوڑ رہا ہے، نہ کوئی کھینچتا ہے
میں اپنے آپ بہے جاتا ہوں ندی کی طرح

نہ ڈوبتا ہوں، نہ رُکتا ہوں، اور نہ سوکھتا ہوں!

۱۱۸

دن میں چھپ جاتے ہیں رات کو چھیڑتے ہیں
درد مرے بھی آنکھ مچولی کھیلتے ہیں

تنہائی کیوں آنکھ پہ پٹّی باندھ کے آتی ہے!

۱۱۹

بارش رُکی ہوئی ہے کل سے
اور گھٹن بھی زیادہ ہے

رو کر کب دل ہلکا ہوا ہے؟

۱۲۰

ہمارے پاؤں اندھیرے میں گرچہ ڈوب گئے ہیں
تم اپنے پاؤں ہمیشہ اُجالوں میں رکھنا!

چراغ سارے ہتھیلی پہ آگ اُٹھائے کھڑے ہیں!

۱۲۱

پتھّر پہ بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا تم نے
کتنا گہرا ہے بولو، اس جھیل کا پانی

ایک ہی بارش میں وہ پتھر ڈوب گیا!

۱۲۲

معلوم ہے یاد کرتے ہو تم
معلوم ہے مجھ کو بھولے نہیں

ہر ہچکی خبر دے جاتی ہے!

۱۲۳

میں ہلکانے لگا ہوں، ہچکیاں لے لے کے سارا دن
مجھے شک ہے کہ سارا دن مجھے تم یاد کرتی ہو!

سنو کیا رات کو اب نیند آنے لگ گئی تم کو؟

۱۲۴

ایک اندھیرا سا اُمڑھ آتا ہے جب آتے ہیں بادل
گڑگڑاتے ہیں مگر کوئی برستا بھی نہیں

تیرے وعدوں کی طرح بجلی چمک جاتی ہے اکثر!

۱۲۵

سرخ کچھ داغ مِلا کرتے تھے رومالوں پہ اکثر
میرے کالر پہ، مری جیب، مرے کپڑوں کے اوپر

گُل مہر تھا میری کھڑکی پہ، کوئی کاٹ گیا ہے!

۱۲۶

کاسنی رنگ، یہ پشمینہ، پہلگام کی سردی
شال لینے کا بھی انداز ترا، سب سے الگ ہے

جی تو کرتا ہے کبھی دھوپ لپٹیں ہم بھی!

۱۲۷

اندھیرے میں فون پہ کتنی باتیں کیں
کتنی دیر جلائے رکھی روشنی تم نے

کل جب میرے گھر کی بجلی چلی گئی تھی!

۱۲۸

جھیل کی سیڑھیوں پر شام کو بیٹھے بیٹھے
زُلفیں سہلاتے تھے ہم اُنگلیوں کے پوروں میں لے کر

اب وہ کنگھی میں لٹکتی ہیں تو اچھی نہیں لگتیں!

۱۲۹

جیسے جڑیں سراغ لگاتی ہیں پانی کا، پتّھر میں
دمہ پڑے تو سانسیں پھیپھڑوں میں اپنی جڑ ڈھونڈتی ہیں!

صحرا میں دیکھا ہے کبھی جب دھوپ میں کیکر کھانستے ہیں!

۱۳۰

شاخ سے کود تو گیا پتّہ
پیٹھ پر لے کے اُڑ گئی ہے ہوا!

پاؤں لگنے تو دے زمیں پہ کہیں!

۱۳۱

جن پیڑوں پر مُولسری کے پھول آتے تھے
کس نے ان پیڑوں کی چھاؤں کاٹی ہے

ان کے نیچے روز انارکلی سوتی تھی!

۱۳۲

چاہے تو جنگلوں کو چھیل دے زمین سے
میں جانتا ہوں زور کتنا ہے ہواؤں میں

صفحہ مگر پلٹ نہ سکی داستان کا!

۱۳۳

دھوپ نہ کھاد، نہ مٹّی پانی اِن کو دینا پڑتا ہے
کتنی اصلی لگتی ہیں یہ نقلی شاخیں پیڑوں کی

لیکن ان پر بیٹھ کے پنچھی اپنی بیٹ گراتے نہیں

۱۳۴

شہر میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھرا ہے
دو قدم پیر اٹھا کے چلنا مشکل ہے!

پیڑ بھی پائینچے اُٹھا کے کھڑے ہیں!

(۱۳۵)

راہیں اس شہر میں اڑتی ہیں پرندوں کی طرح
اور پرندوں کی طرح شاخ پہ رکتیں بھی نہیں

اڑتے پھرتے ہیں، ہر ایک طرف ''فلائی اَوور''!

(۱۳۶)

اتنا اندھیرا ہے زمیں پر
آسمان روشن لگتا ہے

شہر کی بجلی چلی گئی ہے

۱۳۷

گھاس کی پتّی بھی نہ مڑی پیروں کے تلے
خرگوش تھا کوئی، کود پھلانگ کے ٹاپ گیا

کتنی جلدی دیکھا اب کے سال گیا!

۱۳۸

منہ کا نوالہ نِگل تو لو ناں
اگلا نوالہ توڑ رہے ہو!

مستقبل کی فکر لگی ہے؟

۱۳۹

بہت سوتا ہے اور وہ سست ہے، مَیں جانتا تھا
مگر پنڈت بہت جلدی جگا دیتا ہے اُس کو!

خدا کے ساتھ میری نیند بھی خراب کرتا ہے!

۱۴۰

وہ دونوں دعویدار تھے، اپنی زبان کے
اردو تری زباں نہیں، ہندی میری نہیں!

دو بے ادب انگریزی میں لڑتے ہوئے دیکھے!

(۱۴۱)

جِلد کے ٹانکے اس طرح اُکھڑے
سارے صفحے بکھر گئے اُڑ کے!

قول، اقرار، اور عقیدے سبھی!

(۱۴۲)

کتنا کچھ اُس میں اور بھی ٹوٹا
میرے ہاتھوں سے جب کتاب گری!

کتنے کرداروں کو لگیں چوٹیں!

۱۴۳

بادل نے پھر گرج کے گلا صاف کیا ہے
پتّے بجا کے گائے گا ملہار زمیں پر!

یہ شہر ڈوب جاتا ہے لمبے الاپ میں!

۱۴۴

زیور خریدنے زمین رات گئی تھی
تارے سجا کے آسمان بیٹھا ہوا تھا!

سورج کے ساتھ بیاہ ہے صبح زمین کا!

۱۴۵

منڈھی سی آنکھیں، اور آلسی اک لکیر اٹھتی ہوئی دھویں کی
یہ لگ رہا ہے تمھارا چہرہ کسی خیال سے، سُلگ رہا ہے!

لبوں پہ جلتا ہوا یہ سگریٹ، گرا نہ دینا، بیاض پر تم!

۱۴۶

جستجو بھی تو نہیں، نہ کسی چہرے کی امید
کیوں نظر جاتی ہے، ہر موڑ پہ، کیا دیکھنا ہے؟

تو مرے شہر میں آئی ہے سنا ہے میں نے!

۱۴۷

عجیب کپڑا دیا ہے مجھے سِلانے کو
کہ طول کھینچوں اگر، ارض چھوٹ جاتا ہے

اُدھڑنے سینے ہی میں عمر کٹ گئی ساری

۱۴۸

مَیں سب سامان لے کر آگیا اس پار سرحد کے
مری گردن کسی نے قتل کر کے اُس طرف رکھ لی

اسے مجھ سے بچھڑ جانا، گوارا نہ ہوا شاید

۱۴۹

ہوائیں زخمی ہوجاتی ہیں کانٹے دار تاروں سے
جبیں گھِستا ہے دریا جب تری سرحد گزرتا ہے

مرا اک یار ہے، دریائے راوی پار رہتا ہے

۱۵۰

میں رہتا اس طرف ہوں یار کی دیوار کے لیکن
مرا سایہ جو ہے، دیوار کے اس پار گرتا ہے

بڑی کچی سی سرحد ایک اپنے جسم و جاں کی ہے

۱۵۱

کاسنی رنگ تھا ، پشمینہ تھا، گلمرگ کی برفیں
بات کرتے تھے تو ہونٹوں سے نکلتا تھا دھواں

اب بھی سینے سے نکلتا ہے وہ دن یاد کریں تو!

۱۵۲

ہم کو غالبؔ نے یہ دعا دی تھی
تم سلامت رہو ہزار برس

یہ برس تو فقط دنوں میں گیا

۱۵۳

ساتھ ہی ساتھ چلا آیا ہے جتنا بھی سفر تھا
راستے پیروں میں رسّیوں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں

لوٹ کے جانے سے بل کھلتے نہیں اور چڑھیں گے

۱۵۴

روز اٹھ کر چاند ٹانگا ہے فلک پہ رات کو
روز دن کی روشنی میں رات تک آیا کیے

ہاتھ بھر کے فاصلے کو عمر بھر چلنا پڑا!

۱۵۵

کچھ ایسی احتیاط سے نکلا ہے چاند پھر
جیسے اندھیری رات میں کھڑکی پہ آؤ تم

کیا چاند اور زمیں میں بھی کوئی کھِچاؤ ہے!

۱۵۶

چودھویں چاند کو پھر آگ لگی ہے دیکھو
پھر بہت دیر تلک آج اجالا ہوگا

راکھ ہوجائے گا جب پھر سے اماوس ہوگی

۱۵۷

گولی بارود آگ بم نعرے
بازی آتش کی شہر میں گرم ہے

بندھ کھولو کہ آج سب 'بند' ہے

۱۵۸

فراک اٹھا کر منی آنکھ سے کاجل پونچھ رہی تھی
ٹارچ جلائی منّے نے بے چاری چونک گئی

سورج سے شرمائی دیکھی ننھی منّی صبح

۱۵۹

دوسری جنگ عالم کو تو بند ہوئے بھی بیتے سال
اب بھی کچھ جاپانی افسر چھپے ملے ہیں ڈیوٹی پر

تم سے اب کب ملنا ہوگا یا اب بھی ناراض ہو تم

۱٦۰

پرچیاں بٹ رہی ہیں گلیوں میں
اپنے قاتل کا انتخاب کرو

وقت یہ سخت ہے چناؤ کا

۱۶۱

سانولے ساحل پہ گل مہر کا پیڑ
جیسے لیلیٰ کی مانگ میں سیندور

دھرم بدلا گیا بچاری کا!

۱۶۲

جسم اور جاں ٹٹول کر دیکھیں
یہ پٹاری بھی کھول کر دیکھیں

ٹوٹا پھوٹا اگر خدا نکلے

۱۶۳

جھگی کے اندر اک بچہ روتے روتے
ماں سے روٹھ کے اپنے ہی سو بھی گیا ہے

تھوڑی دیر کو ''یدھ وشرام'' ہوا ہے شاید

۱۶۴

جسم کے خول کے اندر ڈھونڈ رہا ہوں اور کوئی
ایک جو میں ہوں ایک جو کوئی اور چمکتا ہے

ایک میان میں دو تلواریں کیسے رہتی ہیں

۱٦۵

لب ترے میرؔ نے بھی دیکھے ہیں
"پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے"

باتیں سنتے تو غالبؔ ہوجاتے

۱٦٦

ہے نہیں جو دکھائی دیتا ہے
آئینے پر چھپا ہوا چہرہ

ترجمہ آئینے کا ٹھیک نہیں!

۱۶۷

ایک کھیت ہے اک دریا ہے

ساتھ ساتھ رہتے بہتے ہیں

ماہی مزارے سب چاکر ہیں

۱۶۸

بس ہوا ہی بھر رہی ہے گولوں میں

سوئی چُبھ جائے تو پچک جائیں

لوگ غصّے میں بم نہیں بنتے!

۱٦۹

کیا پتہ، کب کہاں سے مارے گی
بس کہ مَیں زندگی سے ڈرتا ہوں

موت کا کیا ہے ایک بار مارے گی!

۱۷۰

جو لکھوگے گواہی دے دوں گا
میری قیمت تو منہ پہ لکھی ہے

پوسٹل پوسٹ کارڈ ہوں میں تو

۱۷۱

جلا کے پھولا نہیں سماتا جو بستیوں کو
وہ روسیاہ آسمان کو چھونے لگ گیا ہے

دھوئیں کے چولے پہ خون کی بو کے داغ بھی ہیں

۱۷۲

اب تو ادب ہنر و فن بھی بانٹ چکے ہم
آواز آئے گی نہ اب پرواز جائے گی

قینچی سے کوئی آسمان کاٹ رہا ہے

شعریات

(گلزار کی دو نظموں ''غالب'' اور ''کتابیں'' کا تجزیہ)

غالبؔ

گلی قاسم میں آ کر
تمھاری ڈیوڑھی پر رُک گیا ہوں، مرزا نوشہ!
تمھیں آواز دوں پہلے......
چلی جائیں ذرا پردے میں اُمراؤ
تو پھر اندر قدم رکھوں

چلمچی، لوٹا، سینی، اُٹھ گئے ہیں
برستا تھا جو دو گھنٹے کو مینہ، چھت چار گھنٹے تک
برستی تھی......
اس چھلنی سی چھت کی اب مرمّت ہو رہی ہے
صدی سے کچھ زیادہ وقت آنے میں لگا
افسوس ہے مجھ کو!
اصل میں گھر کے باہر کوئلوں کے ٹال کی سیاہی لگی تھی
وہ مٹانی تھی......

اسی میں بس

کئی سرکاریں بدلی ہیں تمھارے گھر پہنچنے میں !

لفانے جوڑتے تھے تم لیئی سے

خطوں کی کشتیوں میں اردو بہتی تھی

اچھوتے ساحل اردو نثر چھونے لگ گئی تھی

وہیں بیٹھے کمپیوٹر......

وہاں سے لاکھوں خط بھیجا کرے گا

تمھارے دستخط جیسے وہ خوشخط تو نہیں ہوں گے

مگر پھر بھی......

پرستاروں کی گنتی بھی اسدؔ، اب تو کروڑوں ہے!

تمھارے ہاتھ کے لکھے ہوئے صفحات رکھے جا رہے ہیں

تمھیں تو یاد ہوگا......

''مسودہ'' جب رام پور، لکھنؤ سے، آگرہ تک

گھوما کرتا تھا

شکایت تھی تمھیں، ''یارب نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے میری بات

اُنھیں دل اور دے یا مجھ کو زباں اور......''

(یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے میری بات

دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور)

یہیں شیشوں میں لگوائے گئے ہیں
پیرہن اب کچھ تمھارے
ذرا سوچو تو قسمت چار گرہ کپڑے کی اب غالبؔ
کہ تھی قسمت یہ اس کپڑے کی، غالبؔ کا گریباں تھا!

تمھاری ٹوپی رکھی ہے......
جو اپنے دور سے اونچی پہنتے تھے،
شکایت تھی کہ سارے گھر کو ہی مسجد بنا رکھا ہے بیگم نے!

تمھارا بُت بھی اب لگوا دیا ہے، اونچا قد دے کر،
جہاں سے دیکھتے ہو اب، تو سب بازیچہ اطفال لگتا ہے!

سبھی کچھ ہے مگر نوشتہؔ (غالبؔ)
اگرچہ جانتا ہوں، ہاتھ میں جنبش نہیں بُت کے
تمھارے سامنے اک ساغر و مینا تو رکھ دیتے
بس اک آواز ہے جو گونجتی رہتی ہے اب گھر میں
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا مَیں تو کیا ہوتا!!

☆☆☆

گلزؔار کی جدید نظم ''غالبؔ'' کا تشریحی اور تحلیلی تجزیہ

گلزؔار ایک ہمہ جہت شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ فطری شاعر بھی ہیں۔ یقیناً محبت، ریاضت، صداقت اور ذہانت تو ان کی تخلیقات میں شامل ہیں لیکن ان سب کے علاوہ اور ان سب سے اہم چیز خیال و فکر اور تخیل کی وہبی دین ہے جو

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

اکتوبر ۲۰۱۱ء کے پہلے ہفتے میں گلزؔار صاحب سے دوحہ میں ملاقات رہی۔ مجلس فروغِ اردو قطر کے روحِ رواں جناب محمد عتیق صاحب نے عالمی سالانہ مشاعرہ بیادِ فیض اور جلسہ تقسیم ایوارڈ منعقد کیا تھا جس میں بھارت سے گلزؔار صاحب اور پاکستان سے محمد کاظم کو اس سال منتخب کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے گلزؔار صاحب کی شخصیت، ان کی شاعری اور کہانیوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ گلزؔار صاحب نے کلامِ شاعر بزبان شاعر کے تحت اپنی چند عمدہ نظمیں سنا کر ایک تازہ نظم غالب پر یہ کہہ کر پیش کی کہ یہ نظم ابھی ان کے شعری مجموعہ میں شامل نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی حال میں دہلی میں غالبؔ کے پیدائشی مکان گلی قاسم جان میں ترمیم

اور تعمیر کر کے ایک میوزیم بنایا گیا ہے۔ ہر سال ۲۷ر دسمبر کو غالبؔ کی پیدائش کی مناسبت سے ایک جلوس ہاتھوں میں شمعیں لیے ٹاؤن ہال دہلی سے غالبؔ کی حویلی واقع گلی قاسم جان جاتا ہے اور خود گلزارؔ صاحب اس میں شرکت کرتے ہیں۔ جب گلزارؔ صاحب نے یہ تازہ نظم پڑھی تو سامعین نے بہت پسند کیا خصوصاً محفل میں موجود کراچی کی دو بڑی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز جناب پیرزادہ قاسم صاحب اور جناب محمد علی صدیقی صاحب نے بہت تعریف کی۔ راقم نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس نظم کا تجزیہ کر کے عوام تک پہنچایا جائے تو حُسن یوسف بازارِ مصر میں پیش ہوسکتا ہے۔ چنانچہ میری گزارش پر گلزار صاحب نے نظم کے ٹائپ شدہ صفحات میرے حوالے کر دیے۔

گلزارؔ صاحب کے اب تک تین شعری مجموعے ''چاند پکھراج کا''، ''رات پشمینے کی'' اور ''پندرہ پانچ پچھتّر'' بڑی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کہانیوں کے مجموعوں میں ''راوی پار'' اور ''دھواں'' سے انھیں ایک خاص مقام بھی مل چکا ہے۔ یہاں ہم صرف اس ایک ترسیلی نظم کی تشریح سے اس کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈال کر یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ کن کن اقدار نے اس نظم کو اعلیٰ اور عمدہ ترین نظموں کی صف میں سرفہرست کر دیا ہے۔ کسی بھی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ یہ المیہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس کی بعض عمدہ قدریں پرستاروں کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ آرٹ اور لٹریچر میں وقت کے تقاضوں کے تحت تخلیقی قدروں کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ عوامی پسند اور آرٹ کے مخصوص شعبوں کی بڑھتی ہوئی مانگ ایک بڑے وولٹیج (Voltage) کے بلب کی طرح دوسرے کم وولٹیج گولوں کے

نور کو بے نور کر کے ان کے ظاہری وجود کو ختم کر دیتی ہے۔

گلزار دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ یہ بھی حُسنِ اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے کئی عظیم شاعر جنھوں نے اگرچہ کئی اصناف میں شاعری کی لیکن وہ نظم ہی کے شاعر کہلائے جن میں اقبالؔ، جوشؔ اور فیضؔ سرفہرست ہیں۔

آج سے سو برس پہلے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنے مقالے ''شمس العلما حضرت آزاد مرحوم'' میں محمد حسین آزادؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

''چاسر اور ایڈسن نے جو احسان انگریزی نظم و نثر پر کیے ہیں، کیٹو اور پرماکر نے جو خدمات ہندی کا ویہ کے حق میں کیں ان سے زیادہ گراں مایہ خدمات اور احسانات آزادؔ نے اردو نظم پر بالخصوص اور اردو زبان پر بالعموم کیے ہیں۔ اگر امیر خسرو نے اردو کا پہلا شعر موزوں کیا، اگر ولیؔ نے پہلا دیوان اردو نظم کا مرتب کیا، اگر بیجو باورے نے پہلا دُھرپد ہندی بولوں میں باندھا، اگر رودکیؔ نے پہلا شعر فارسی کا کہا تو حضرت آزادؔ نے اس خیالِ نو کی اشاعت و تعمیل نہ کی ہوتی تو آج ہم ان نظموں سے نا آشنا ہوتے۔''

گلزارؔ صاحب کی نظم کا مطالعہ اور تجزیہ مابعد جدیدیت کے شعری چار چوب میں کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے دانستہ طور پر عمیق ادبی تجزیہ سے گریز کیا ہے تاکہ مضمون کو خشک اور سنگلاخ بنانے کے بجائے زعفران کی طرح نرم رنگین اور خوشبو سے بھرا رکھیں۔ ملٹن نے اچھی شاعری اور اچھے شعر کی نسبت تین قدروں کا ذکر کیا ہے۔ اس

میں صداقت یا حقیقت ہو، اس میں جوش یا جذبات ہوں اور اس میں سادگی یا شگفتگی ہو۔ گلزارؔ صاحب کی یہ نظم سراپا صداقت، جذبات سے لبریز اور سادگی سلاست میں بہتے ہوئے پانی کی روانی رکھتی ہے۔

جہاں تک ابلاغ اور ترسیل کے مسئلہ کا تعلق ہے، یہ نظم بڑی تیزی اور کامیابی کے ساتھ قاری تک پہنچ جاتی ہے۔ اس نظم میں ادق، غیر مانوس اور عربی فارسی کے الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس میں قصص اور اساطیر کی اصطلاحات اور تلمیحات پیش نہیں ہوئیں اور نہ ہی صنائع لفظی اور معنوی کی مدد سے اسے گورکھ دھندہ کی دستاویز بنایا گیا، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں شگفتگی کے ساتھ اردو ہندی رسیلے شبدوں سے عوام فہم لہجہ میں نغمہ سرائی کی گئی ہے۔ تمام نظم میں مشکل سے ایک یا دو اضافتیں نظر آتی ہیں وہ بھی غالبؔ ہی کے شعر کو پیش کرتے ہوئے ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ اپنی جگہ ایک آبدار موتی ہے جو نظم کے مصرعوں میں نغمگی کے ترنم کے رشتے سے جڑا ہوا ہے۔ نظم اور غزل میں یہ بھی ایک فرق ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنے موضوع کی اکائی ہوتا ہے۔ یعنی نظم کی طرح شعر ایک دوسرے سے جڑے نہیں رہتے، اسی لیے غالبؔ جیسے یکتائے روزگار نے تنگنائے غزل کا شکوہ کیا تھا۔ یہ بھی دلچسپ ہے کہ گلزارؔ نے غالبؔ جیسے عظیم، مشکل اور پیچیدہ غزل کے شاعر کو نظم کے سہل ممتنع میں سجایا ہے۔

گلزارؔ کی نظم عقیدت کی حاضری سے شروع ہو کر غالبؔ ہی کے اُس شعر پر ختم ہوتی ہے جس میں غالبؔ کی شعری عظمت، عدم اور وجود کی حقیقت، حیات اور ممات کی حالت، سود اور زیاں کی کیفیت اور واجب و ممکن کی قیمت اور عظمت کے رموز کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

(آغاز) گلی قاسم میں آ کر

تمھاری ڈیوڑھی پر رُک گیا ہوں، مرزا نوشہ!

تمھیں آواز دوں پہلے

چلی جائیں ذرا پردے میں امراؤ

تو پھر اندر قدم رکھوں

(اختتام) بس اک آواز ہے جو گونجتی رہتی ہے اب گھر میں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!!

گلزؔار باریک بین اور دقیق نگار ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کے خطوط کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے۔ غالبؔ کے (۸۸۶) اردو خطوط اور تقریباً اسی تعداد کے فارسی خطوط مطبوعہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ گلزؔار کی ۱۹۸۸ء کی غالبؔ سیریل ہو یا ۲۰۰۵ء کی کتابی شکل میں مرزا غالبؔ کا ایک سوانحی منظر نامہ، غالبؔ کے خطوط اور ان کے اشعار کے مستند اور معتبر استفادے نے غالبؔ کی حیات اور شخصیت کی کتابی پینٹنگس کو خواص کے دیوان خانوں سے نکال کر عوام کے گھروں اور گھروندوں کی چلتی پھرتی تصویروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ قاسم جان کی گلی کا تذکرہ غالبؔ کے خطوط میں یوں بھی ملتا ہے، جو غدر کے موقع کی عکاسی کرتا ہے:

''قاسم جان کی گلی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خان کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔''

مصرعہ میں مرزا نوشہ کے نام کی رعایت شاعر کی محبت اور سپردگی کی علامت

ہے جو غالبؔ کے قریبی دربار اور بازار کے احباب کو حاصل تھی۔گلزارؔ نے پہلے ہی مصرعہ میں قربت اور خلوص کا اظہار کر کے سننے والوں کو بتادیا کہ وہ غالبؔ کے قریبی نیاز مند یا خود ان کے قول کے مطابق تیسرے قریبی خدمات گزار ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ یہ رستے اور رشتے دل سے دل کو ہوتے ہیں۔مشہور فارسی کہاوت ہے:

دل با دل راہ دارد

امراؤ جان غالبؔ کی اکلوتی بیوی تقریباً غالبؔ کی ہم عمر تھیں اور غالبؔ کے انتقال کے بعد ایک برس سے زیادہ زندہ بھی نہ رہ سکیں۔نماز وروزہ اور پردہ کی پابند۔غالبؔ نے جہاں طنز ومزاح میں شوخیاں کیں وہیں زندگی بھر امراؤ کی ستائش بھی کی۔گلزارؔ نے ڈیوڑھی کی دہلیز پر غالبؔ اور امراؤ کو یاد کر کے ہرگوپال تفتہؔ اور مہدی مجروحؔ کی یاد تازہ کر دی۔

ایک کامیاب نظم کے الفاظ ذہن میں سہ بُعدی (Three dimentional) پیکر بنا کر اس کو متحرک کر دیتے ہیں یعنی سامع اور قاری کی نظر کے سامنے یکے بعد دیگر آتے رہتے ہیں۔اگر شاعر کسی منظر یا واقعہ کی نقش نگاری کر رہا ہے تو اس کے نقش کو اصل کے مطابق ہونا چاہیے۔یہاں وہ امیجری کے رخش کو بے لگام نہیں کر سکتا۔غالبؔ ۲۷/جولائی ۱۸۶۲ء کو مرزا اعلاؤالدین خاں علائیؔ کو خط میں لکھتے ہیں:

> ''میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔چھتیں ٹپک رہی ہیں۔چھت چھلنی ہے۔ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔''

غالبؔ میر مہدی مجروحؔ کو ۲۶/ستمبر ۱۸۶۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی، سعادت
خان کی نہر ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت
گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلم دان سب توشہ خانے میں، فرش پر کہیں
لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے۔''

گلزؔار کہتے ہیں:

چلمچی لوٹا سینی اٹھ گئے
برستا تھا جو دو گھنٹے کو مینہ، چھت چار گھنٹے تک برستی تھی......
اُسی چھلنی سی چھت کی اب مرمت ہو رہی ہے

شاعر نے ماضی کو حال سے جوڑ کر نظم کے مضمون میں صورتِ حال کو بیان کر دیا۔ یہ ایک قسم کی مکالمہ نگاری ہے جو غالؔب کے وجود کو درک کر کے کی جا رہی ہے تا کہ لوگ باخبر ہوسکیں۔ یہ کام صرف ایک کامیاب ناظم ہی اپنی نظم میں کرسکتا ہے۔ اس واقعہ میں غالؔب کے خطوط کی یادداشت سے حظ اور موجودہ تعمیر سے اطلاع اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔

پھر شاعر واجب کفائی کی مثال بن کر تمام خلقت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر افسوس کرتا ہے کہ اس کام کے لیے ایک صدی سے زیادہ وقت لگا کیوں کہ ذیل کے مسائل درپیش تھے۔

صدی سے کچھ زیادہ وقت آنے میں لگا
افسوس ہے مجھ کو
اصل میں گھر کے باہر کوئلوں کی ٹال کی سیاہی لگی تھی

وہ مٹائی تھی

اس میں بس!

کئی سرکاریں بدلی ہیں تمھارے گھر پہنچنے میں......

یہ امر واقعہ تھا کہ غالبؔ کے گھر کے باہر کا علاقہ کوئلوں کی ٹال سے گھر کر سیاہ ہو چکا تھا۔ یہاں شاعر نے مصرعہ میں کوئلہ، سیاہی اور مٹانے کا عمدہ برتاؤ کیا ہے اور سیاسی حالات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

گلزارؔ کی نظم سے ان کی غالبؔ سے محبت اور ان کی نظر میں غالبؔ کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ اس نظم میں غالبؔ کے چار پانچ اشعار یا مصرعوں کے فقروں کو تضمین کر کے نئے نئے مضمون تراشے گئے ہیں جو نظم کا اچھوتا تخلیقی رخ ہے۔

شاعر کہتا ہے:

یہیں شیشوں میں لگوائے گئے ہیں

پیرہن اب کچھ تمھارے

پھر فوراً پیرہن کی نسبت سے مضمون باندھتا ہے۔

ذرا سوچو تو قسمت چار گرہ کپڑے کی اب غالبؔ

کہ تھی قسمت میں یہ اُس کپڑے کی غالبؔ کا گریباں تھا

یہاں ذہن میں اچانک غالبؔ کا مشہور شعر ابھرنے لگتا ہے:

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

عاشق کا گریباں ہمیشہ چاک رہتا ہے۔ غالبؔ نے تو اس تار تار پیرہن کی قسمت پر ترس کھایا تھا لیکن گلزارؔ نے مضمون کو الٹ کر اسے وقار اور عظمت کا مینارہ

بنا دیا کہ وہ چارگر کپڑا کتنا خوش نصیب تھا جو غالبؔ کا گریباں تھا۔جس کا تار تار غالبؔ کی گردن کے رگ و پے سے مس ہوتا تھا۔گلزارؔ نے ''مرزا غالبؔ ایک سوانحی منظر نامہ'' کے مقدمہ میں اپنی غالبؔ سے الفت اور جذباتی قربت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں اکثر کہا کرتا ہوں۔ غالبؔ کے ہاں تین ملازم تھے جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ایک کلو تھے جو آخر دم تک ان کے ساتھ رہا، دوسری وفادار تھیں جو تتلاتی تھیں اور تیسرا میں تھا۔وہ دونوں تو اپنی عمر کے ساتھ رہائی پا گئے ہیں۔میں ابھی ملازم ہوں۔غالبؔ کا اُدھار لینا، ادھار نہ چکا سکنے کے لیے پُرمزاح بہانے تراشنا پھر اپنی خفت کا اظہار کرنا جذباتی طور پر (emotionally) مجھے غالبؔ کے قریب لے جاتا ہے۔کاش میری حیثیت ہوتی اور میں غالبؔ کے سارے قرض چکا دیتا۔اب حال یہ ہے کہ میں اور میری نسل اس کی قرض دار ہے۔''اس ایک لفظ ''کاش'' میں گلزارؔ کے جذبات اور عقیدت کا سمندر سمایا ہوا ہے۔شاعر نے بہت صحیح کہا ہے کہ تمام برصغیر غالبؔ کا قرض دار ہے۔ یہ تو غالبؔ ہی کے دل سے پوچھیں کہ اس جینیس (genius) پر دنیا کتنی تنگ ہو چکی تھی جس کو اس نے ہنس ہنس کر جھیلا لیکن آخر غالبؔ بھی انسان تھے کبھی کبھار اپنی ناقدری پر شکوہ بھی کیا۔مالک رام کی کتاب خطوط غالبؔ میں غالبؔ کا وہ خط جو غلام حسنین قدرؔ بلگرامی کے نام ہے اور جو غالبؔ کے انتقال سے صرف کچھ مہینے پہلے لکھا گیا ہے اس سے غالبؔ کے اندرونی دکھ درد، دنیا کی ناقدری اور ان کی کسمپرسی کا پتہ چلتا ہے۔لکھتے ہیں:

''حضرات!

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے۔ اصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر سننا تو ممکن ہی نہیں، بہرا ہوں، شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتّر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں، ساٹھ برس بکا، نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔ بقول انوریؔ

اے دریغا نیست ممدوحِ سزاوار مدیح

اے دریغا نیست معشوقِ سزاوار غزل

(افسوس کہ ممدوح اس قابل نہیں کہ اس کا قصیدہ لکھا جا سکے اور معشوق اس قابل نہیں کہ اس پر غزل کہی جا سکے)

سب شعرا سے اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔ اسداللہ خاں غالبؔ

اے کاش غالبؔ جانتے کہ آج ان کے چاہنے والے اور ان کے خطوط کو پڑھنے والے کروڑوں پرستار موجود ہیں۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

پرستاروں کی گنتی بھی اسد اب تو کروڑوں میں ہے

تمھارے ہاتھ کے لکھے ہوئے صفحات رکھے جا رہے ہیں

غالبؔ کی ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

میں عندلیبِ گلشن ناآفریدہ ہوں

ان کا یہ بیان تھا:

گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

کبھی کہتے تھے:

آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا

غالبؔ کے اس ترسیلی اور ابلاغی دشوار مسئلہ کو گلزارؔ نے بڑی سلیس اور شگفتہ زبان میں یوں پیش کیا ہے:

تمھیں تو یاد ہوگا
مسودہ جب رام پور سے لکھنؤ سے آگرہ تک
گھوما کرتا تھا
شکایت تھی تمھیں
''یارب نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات......
انھیں دل اور دے یا مجھ کو زباں اور
زمانہ ہر زباں میں پڑھ رہا ہے اب تمھارے سب سخن غالبؔ
سمجھتے کتنا ہیں یہ تو وہی سمجھیں یا تم سمجھو

یہ غالبؔ کے کلام کا جادو ہے کہ اب غالبؔ کا اردو کلام ہندی، رومن کے علاوہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں دستیاب ہوتا ہے۔ غالبؔ نے سچ کہا تھا کہ میری شہرت میرے مرنے کے بعد ہوگی:

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالبؔ کے خطوط اردو نثر کا نیا رُخ مانے جاتے ہیں۔ غالبؔ نے پہلے فارسی میں پھر اردو خطوط میں مکالمہ نویسی سے قدیم تشریفاتی تحریری عبارتوں کو نکال کر زندہ بات چیت میں تبدیل کیا یعنی غالبؔ نے قلم کی زبان سے ہمیں بات کرنے کا سلیقہ

اور لہجہ سکھایا اور اس کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کرنے کے لیے اس شربت گفتار میں مزاح اور طنز کی شراب بھی ملا دی۔ اس اہم اور دلکش موضوع کو گلزارؔ نے خاص منظر کشی اور اپنی علامتی شاعری کے ہنر سے شاہکار بنا دیا اور پھر نہ صرف ماضی سے ملایا بلکہ اس کو مستقبل سے جوڑ کر ہزاروں داستانیں ایک ہی سانس کے جھونکے میں سنا دیں۔

خطوط کے مطالعہ اور لفافوں کے نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ خاص اور خصوصی لفافے آگرہ اور دلّی میں چھپواتے تھے اور پھر ان کو گھر میں بیٹھ کر لفافے کی شکل میں جوڑ لیتے تھے۔ گلزارؔ کہتے ہیں:

جہاں کلّن کو لے کر بیٹھتے تھے، یاد ہے؟
بالائی منزل پر
لفافے جوڑتے تھے تم لیئی سے
اچھوتے ساحل اردو نثر چھونے لگ گئی تھی
وہیں بیٹھے گا کمپیوٹر......
وہاں سے لاکھوں خط بھیجا کرے گا
تمھارے دستخط جیسے، وہ خوشخط تو نہیں ہوں گے
مگر پھر بھی......

جن لوگوں نے غالبؔ کا دستخط دیکھا وہ مصرعۂ آخر کی داد دیں گے۔ غالبؔ بہت خوشخط تھے۔ غالبؔ کے بہت سے خطوط آج بھی محفوظ ہیں جن پر متن کے علاوہ غالبؔ کی مہریں، کچھ ہندسے اور علامتیں بھی ہیں۔

بڑا شاعر نہ صرف قطرے میں دجلہ دیکھتا ہے بلکہ قطرے میں دجلہ دکھاتا بھی ہے۔

خطوں کی کشتیوں میں اردو بہتی تھی
اچھوتے ساحل اردو نثر چھونے لگ گئی تھی

یہاں گلزؔار صاحب نے سمندر کو نہ صرف کوزہ میں بند کیا ہے بلکہ اس میں تلاطم بھی پیدا کیا ہے۔ کیا غالبؔ کے خطوط کا جدید اور موثر اثر اردو نثر پر اس سے بہتر بیان کیا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کا نہ صرف بیان بلکہ ان کے رہنے کا مکان اور ان کی شخصیت کا جہان بھی جداگانہ تھا۔ جب کسی معمولی شاعر کا تخلص بھی اسد ہے سنا تو اپنا پرانا تخلص اسد کو بدل کر نیا تخلص غالبؔ رکھ لیا۔

غالبؔ نے اپنے مرنے کی تاریخ اپنی زندگی ہی میں کہہ لی تھی۔

مرد غالبؔ بگو کہ غالبؔ مرد

جس کی رو سے ۱۲۷۷ ہجری نکلتے تھے۔ اتفاق سے ۱۲۷۷ ہجری میں دہلی میں ہیضہ پھیلا۔ میر مہدی مجروؔح نے غالبؔ کو سال ختم ہونے پر لکھا اب تو یہ سال بخیر گزر گیا، اب حضور کیا فرماتے ہیں، تو غالبؔ نے کہا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہیں سمجھا واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔''

غالبؔ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں: ''مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا، حافظ، بساطی، پنچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر لمبے بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا۔ غالبؔ کی ہر ادا اُن کی وضع قطع کی طرح جداگانہ تھی۔ اسی لیے تو تمام لوگوں سے جداگانہ اونچی ٹوپی

پہنتے تھے۔گلزؔار نے اس تکلف کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔

تمھاری ٹوپی رکھی ہے
جو اپنے دور سے اونچی پہنتے تھے

اس میں صنعتِ ابہام ہے۔شاعر نے اپنے دور سے کہہ کر غالبؔ کو تمام ہم عصر شاعروں پر غالب اور بلند قامت کر دیا۔ پھر غالبؔ کی جوتیوں کا ذکر بھی ایک خوبصورت لطیفہ کے اشارے کے ساتھ

تمھارے جوتے رکھے ہیں
جنھیں تم ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے
شکایت تھی کہ سارے گھر کو ہی مسجد بنا رکھا ہے بیگم نے

یہاں شاعر نے غالبؔ کے اُس مشہور لطیفہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں غالبؔ نے اپنی بیگم سے مخاطب ہو کر کہا تھا، یہ گھر تو میرا تھا لیکن تم نے ہر جگہ نماز پڑھ کر اس کو اللہ کا گھر مسجد بنا دیا ہے۔ پھر اگر کوئی قدم رکھے تو کہاں رکھے اور کرے تو کیا کرے اس لیے جوتے اتار کر ہاتھ میں رکھ لیے ہیں۔

اس نظم کا آخری حصہ نتیجہ خیز اور بڑا ہی دلکش ہے جو ایک کامیاب نظم کے عمل کا نقطۂ اوج یا (Climax) ہی ہو سکتا ہے۔گلزؔار نے اس آخری حصے کو غالبؔ کے تین اشعار سے سجا کر محراب نظم کی مینا کاری کی ہے۔ یہاں الفاظ و معانی کے سنگ و تیشہ سے نادر مضامین کے بت تراشے ہیں جن کی بے زبانی دورِ حاضر کی زبان بن گئی ہے۔

تمھارا بت بھی اب لگوا دیا ہے اونچا قد دے کر
جہاں سے دیکھتے ہو اب، تو سب بازیچۂ اطفال لگتا ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

سبھی کچھ ہے مگر نوشہؔ (غالبؔ)

اگرچہ جانتا ہوں، ہاتھ میں جنبش نہیں بت کے

تمھارے سامنے اک ساغر و مینا تو رکھ دیتے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بس اک آواز ہے جو گونجتی رہتی ہے اب گھر میں

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ نظم دراصل ایک مکمل ترسیلی نظم ہے جس میں ماضی اور حال کو مستقبل سے جوڑا گیا ہے۔ اس نظم میں گذشتہ اور موجودہ واقعات نگاری کے ساتھ ساتھ شاعر کی جذبات نگاری نظم کے ہر ہر لفظ سے نمایاں ہے جو پڑھنے اور سننے والے کو مسحور کرنے کے لیے کافی ہے۔ نظم میں غالبؔ کے شعر، مصرع اور فقرے اس طرح پروئے گئے ہیں جیسے موتیوں کی مالا میں کچھ کچھ فاصلوں پر لعل و یاقوت اور زمرد کے ٹکڑے۔ نظم کے تسلسل اور حُسن بیان کو برقرار رکھنے کے لیے اور مزید بحر کی نغمگی کے فطری بہاؤ کو تیز کرنے کے لیے بعض لفظوں کو موڑ کر، جوڑ کر، کچھ کچھ الفاظ چھوڑ کر صحیفۂ عشق کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی نظم کا مصرعہ صدا بن کر گونجا فوراً سننے کے ذہن میں اُس کی تصویر ابھرنے لگتی ہے۔ اسی کا نام جادو بیانی اور شعری کرشمہ ہے۔ بعض غزل اور نظم کے شاعروں نے تنگ دامنی کا

شکوہ کیا ہے لیکن اس نظم کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ:

سلیقہ ہو تو گنجائش بہت ہے

یقیناً جب تک غالبؔ کا کلام ہمارے درمیان موجود ہے ہم غالبؔ سے کسبِ فیض کرتے رہیں گے۔ دنیا اُس جینیس (genius) نابغۂ روزگار دیدہ ور کے لیے بازیچۂ اطفال کیوں نہ ہو جس نے سوال کیا تھا؟

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

☆☆☆

کتابیں

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے۔
جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں

وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ

جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے
بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹّی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا
زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گذرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردہ پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول اور
مہکے ہوئے رقعے
کتابیں مانگنے گرنے اٹھانے، کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا؟
وہ شاید اب نہیں ہوں گے

☆☆☆

”کتابیں“

گلزؔار کی نظم کا تحلیلی تبصرہ اور تجلیلی تجزیہ

گلزؔار نظم کے مستند شاعر ہیں۔ ان کی نظم میں تخیّل جذبات، صداقت سلاست کے ساتھ زبان کا چٹخارہ بھی موجود ہے۔ ان کی نظم اکیسویں صدی کے عصری مزاج سے منسلک ہے اسی لیے مقبول ہے۔ عامی اور عالم دونوں ان کی شاعری کے شیدا ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندی، روایت پذیری، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے بعد کی عصری حس نمایاں ہے جو آج ایک بڑی شاعری کی شناخت اور علامت بھی ہے۔ نکلسن کہتا ہے بڑی شاعری میں اپنے دور کی حسیّت کے ساتھ ساتھ ماضی کی قدروں کا احساس اور مستقبل کے امکانات کا محاسبہ بھی رہتا ہے۔

بیسویں صدی کے دو عظیم اردو شاعر علاّمہ اقباؔل اور جوشؔ ملیح آبادی جنھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں ریاضت کی ہے مگر وہ نظم ہی کے شاعر تھے۔ مضمون کا تسلسل واقعات کا اُتار چڑھاؤ، لہجہ کی رنگارنگی کو غزل کی تنگ دامنی برداشت نہیں کرسکتی۔ اسی لیے اُردو نظم نے ڈیڑھ سو سال کے قلیل عرصے میں کثیر فتوحات کیے

ہیں۔

گلزار کی نظم ''کتابیں'' اُردو کی شاہکار نظموں کی صف میں نمایاں ہے۔ یہ نظم اگر چہ برصغیر کی ہندوستانی زبان میں پڑھی اور لکھی جاسکتی ہے لیکن اس نظم کے اکثر موضوعات اور جذبات دنیائے ادب کی کتابوں سے بھی مربوط ہیں۔ چنانچہ گلزار کی نظم ''کتابیں'' دنیائے ادب کو تحفہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔ گلزار کی شاعری ارتقائی منازل طے کر کے ندرت خیال و بیان کے میناروں پر جاگزیں ہوتی جارہی ہے۔ مولانا رومؒ نے کہا تھا میری عمر کو تین لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ میں کچّا تھا پک گیا اور پھر فنا ہو گیا۔

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بودم پختہ شدم سوختم

یعنی انسان مہد سے لحد تک سفر کرتا ہوا ان کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ جب انسان پختہ ہو جاتا ہے تو اس کا جسم کمزور مگر اس کی ذہنی فکری قوت قوی اور تجربہ وسیع ہو جاتا ہے اس لیے ہر ہنری کام جو اس پختہ اور فنا کے درمیان ہوتا ہے عظیم ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی لیے ہم گلزار سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اسی طرح شاہکار تخلیق کرتے رہیں۔

اس موقع پر سب سے پہلا یہ سوال اٹھتا ہے کہ شعر تخلیقی اُپج ہے یہاں تبصرہ تشریح اور تجزیہ کی گنجایش کہاں ہے؟ اسی لیے بعض شاعروں نے ظاہری طور پر اس نظریہ کی حمایت کی کہ ''شعر مرا مدرسہ کی برد'' اور باطنی طور پر مسلسل مدرسہ کی تختی پر اپنا شعر احباب اور شاگردوں سے لکھواتے رہے۔ جن شعرا کے کلام پر تبصرہ تشریح اور تجزیہ

کیا گیا انہی کا اکثر کلام تشہیر ہو کر شعری تہذیب کی تربیت ثابت ہوا۔ اگرچہ تنقید میں تنقیص اور تعریف دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ مرزا غالبؔ جس کے آگے اُردو کے اغلب شعرا مغلوب ہیں درجنوں خطوں میں اپنے اشعار کی تشریح اور توضیح خود کرتے ہیں اس کے باوجود آج پچاس سے زیادہ شرحیں ان کے کلام پر نظر آتی ہیں۔ تنقید مدح سرائی کا نام نہیں۔ تنقید جانب داری کا کام نہیں۔ تنقید معمّا سازی اور چیستان کا جام نہیں اسی وجہ سے صحیح تنقید عام نہیں۔ تنقید نوک خار سے گل کو پَر پَر کر دینے کا عمل نہیں بلکہ گلوں کو شعری گلدستہ میں سجا کر پیش کرنے کا نام ہے۔ اگرچہ اس گلدستے میں شامل خار و خاشاک کا بھی ذکر ہو۔ اسی لیے تو جوشؔ نے نقاد کو للکارا تھا۔

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو
یعنی اک لَے سے لبِ ناقد کو کھلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تلنا چاہیے
کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

پس انسان جب خود اپنی پیٹھ کو دیکھنے کے لیے آئینہ کے چہرے یا کسی چہرے کی دو آنکھوں کا محتاج رہتا ہے تو شعری اُپج جو تحت شعور کا جذباتی سیلاب ہے اس میں تیر کر پار اُترنے کے لیے پیراکی کے ساتھ ساتھ ہواؤں کے مزاج موجوں کے دباؤ اور ساحل کی سمت کے علم کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔

ایک کامیاب اور کارآمد تشریح اور تجزیہ سے صاحب تصنیف، پڑھنے والے اور ادب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ادب برائے ادب اور ادب برائے ہدف پوری طرح سے صحیح اس لیے بھی نہیں کہ تخلیق زندگی سے جدا نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ادب سے ہدف مکمل طور پر علاحدہ نہیں ہوسکتا۔آیئے اس گفتگو کے بعد نظم کا تحلیلی سفر تجزیاتی حوصلے کے ساتھ کریں۔

نظم منظر کشی سے شروع ہوتی ہے۔

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں

یہاں گلزار نے ایک شیشے کی الماری میں رکھّی ہوئی کتابوں کو تخیّل کی نگاہ سے دیکھ کر صنعت حسن تعلیل کو جذبات کے ساتھ پیش کیا۔ چنانچہ اب ہر سننے اور پڑھنے والے کو الماری کی کتابیں شیشوں سے جھانکتی اور حسرت سے تکتی نظر آنے لگیں۔ یہ فطری شاعر کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ ان کہی بات کو کہاوت اور ناموجود کو وجود کا جسم عطا کر دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے آنکھ وہ شئے نہیں دیکھ سکتی ذہن جس کو نہیں جانتا۔ ہم سب نے ہزار بار الماریوں میں کتابیں دیکھیں لیکن کسی نے گلزار کی طرح شعری بصیرت کو چشمی بصارت میں تبدیل نہیں کیا یعنی گلزار کی طرح قطرے میں دجلہ نہ دیکھا اور نہ دکھایا۔

شاعری الفاظ سے زیادہ معنی سے سروکار رکھتی ہے۔ معنی کثیر اور لفظ قلیل ہونے کے باعث، معنی الفاظ کے اطراف بکھرے پڑے رہتے ہیں لیکن چونکہ معنی کا

کوئی جسم نہیں ہوتا اس لیے سطروں سے زیادہ بین السطور مطالب تہہ در تہہ نامری طور پر موجود رہتے ہیں جنھیں ہر شخص اپنی فکر اور ہمّت کے مطابق حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں شاعر المباری میں بند کتابوں کی منظر کشی کے دروازے سے ایک بہت بڑے ذہنی میدان میں ہمیں داخل کر رہا ہے۔ جہاں جدید اور روایتی تہذیب کی قدروں کا منظر نامہ مناظرہ اور محاسبہ ہے۔

عشق کا سوز و گداز عاشق اور معشوق دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ ''دل بہ دل راہ دارد'' کے معنی بتاتے ہیں کہ یہ راستہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ یہاں کتابیں معشوق اور قاری عاشق ہیں۔ یہاں معشوق حسرت کی نظر اور بے چینی سے یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کا قدیم عاشق اب کمپیوٹر کے نظاروں میں اپنی شامیں گزارتا ہے۔ عاشق معشوق کے جلوے سے دوری اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ اب کتابیں بیداری میں نہیں بلکہ خواب میں قاری سے ملاقاتیں کرتی ہیں۔

جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہو گئی ہے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں

شاعر نے نظم کے چہرے میں کتابوں سے دوری، کتابی ریڈر شپ کی کمی اور موجودہ دور میں کمپیوٹر اور ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی ترقی اور گلوبل ولیج کے ماحول سے وابستگی کے حقیقی اور سچے اثرات کو شعری رس میں گھول کر جذبات کے ساغر پیش

کیا۔شاعر نے فوراً روایت سے رشتہ جوڑ کر ذہن کو جھنجھوڑا کہ انہی کتابوں میں جو انسانی، سماجی، علمی، اخلاقی اور مذہبی قدریں اشعار میں، خاکوں، کہانیوں، افسانوں، ڈراموں، ناولوں میں پڑھی اور سُنی جاتی تھیں وہ ذہن کے خانوں میں ہمیشہ زندہ اور تازہ رہتی تھیں آج موجود نہیں۔ یہی نہیں بلکہ انسانی اور خاندانی رشتے جن سے سماج اور خاندان بندھا رہتا تھا وہ بندھن جس کا تذکرہ وہ تہذیب و تربیت، طور وطریقہ جو تخلیقی شہ پاروں کی وجہ سے کتابوں کے نقش کے ذریعے دل و دماغ پر ثبت ہوتا تھا آج بگڑ چکا ہے۔

جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں
وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں

انسان اشرف المخلوقات صرف شعورِ ذات کی وجہ سے ہے۔ ورنہ بدنی اور حسّی طاقتوں کے لحاظ سے دوسری مخلوقات سے بہت نیچے ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ پانچ چھ فٹ کے انسان کے سامنے پوری کہکشاں چھوٹی ہے۔ انسان اس قدر عظیم صرف انسانی عالی قدروں اور اس کے رشتے عبد اور معبود سے ہے۔ مقامِ انسان، حقوقِ انسان، احترام انسان کا تعین قدروں اور رشتوں سے ہے۔ قدروں کے آفتاب کی ایک شعاع اخلاق ہے ۔یہاں گلزار نے آج کے پُر آشوب مادّی ماحول میں روحانی بالیدگی کی کمی کا خوب صورت اشارہ کیا ہے کہ کتاب ہی وہ صحیفہ ہے جس میں

اخلاقیات کا ہر درس نظر آتا ہے۔

اوپر کے مصرعوں اور فقروں میں ''قدریں''، ''سیل'' اور ''رشتے''، ''ادھڑے'' صنعتِ ایہام میں ہیں یعنی ایک تو ان کے قریبی معنی ہیں اور دوسرے ''دور'' بعید معنی ہیں جو شعر کی عظمت کے نقیب ہیں۔ کتابیں جو قدریں سناتی ہیں وہ ہمیشہ ہمارے ذہن میں زندہ رہتی ہیں، دوسرے معانی یہ ہیں کہ انسانی قدریں زندۂ جاوید ہیں۔ ہمیشہ زندہ رہیں گی جن کی سخن گو کتاب ہے۔ رشتہ ایک معنی میں وہ دھاگا ہے جو باندھنے اور بُننے کے کام آتا ہے دوسرے معنی میں وہ تعلق ہے جو انسان سے انسان کو اور انسان کو معبود سے ہے۔

گلزؔار نے نظم میں تخیّل کے ساتھ تنوع بھی برتا ہے جو آسان کام نہیں۔ نظم میں غزل کے مقابل آزادی تو ہے مگر یہ آزادی نظم کی بربادی ہو جاتی ہے اگر شاعر تخیّل کی آماجگاہ کو نظم کے بہاؤ کے ساتھ سازگار نہ رکھے یا ذہنی مضمون کے تسلسل کو مجروح اور مخدوش کر دے۔ گلزؔار اس لیے بھی عمدہ نظم کے شاعر ہیں وہ ان نکات کی باریکیوں اور رموز سے واقف ہیں۔ یہ عمل ریاضت سے نہیں بلکہ سعادت سے ظاہر ہوتا ہے۔

''کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے'' یہ نظم کا سب سے اہم حصّہ ہے جس نے اس نظم کو شاہکار نظموں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اس حصّے میں شاعر نے کتاب کے صفحے پر یا کمپیوٹر کے پردے پر ظاہر ہونے والے کلام پر کلام کیا ہے۔ یہ درحقیقت آج کل کی بعض شائع ہونے والی کتابوں یا فیس بک پر تکمیل کی جانے والی شاعری اور تخلیق نما کاوشوں پر صحیح ریویو ہے۔ اگر کتاب کا صفحہ پلٹتے وقت سسکی نکلتی ہے تو کتاب جو درست اور عمدہ شاعری کا خزانہ تھی رو رہی ہے کہ یہ کیا میرے اندر بھرا جا رہا ہے۔

اگر یہ کمپیوٹر پر صفحہ بدلتے سسکی ہو رہی تو شاعری رو رہی ہے کہ آج کے دور میں میری کیا حالت ہو گئی ہے۔

یہاں گلزآر نے لفظ و معنی پر بحث کی ہے اور نادر تشبیہات اور استعارات سے ترسیل و ابلاغ کا کام نکالا ہے۔ یہاں شاعر نے روایتی اور جدید شاعری کا تقابل بھی کیا ہے۔ یہاں گلزار نے لفظوں کو استعاروں میں ڈھالا ہے۔ فیض احمد فیضؔ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا لفظ کو استعارہ بنانا میں نے غالبؔ سے سیکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالبؔ سے بڑا استعارہ کا خالق اردو ادب میں نہیں گزرا کیونکہ وہ لفظ شناس اور معنی پرور تھے۔ قدیم عظیم شعرا ایسے چنندہ اور حسب ضرورت الفاظ استعمال کرتے کہ ایک لفظ اگرچہ دیکھنے میں اک شجر کی طرح ہوتا مگر اس میں کئی معنی کے پھل اُگتے اور غالب اسی کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہتے ہیں۔ گلزار کہہ رہے ہیں کہ اب تو الفاظ کے درختوں پر معنی کے پھل نہیں اُگتے یہی نہیں بلکہ لفظ بغیر پتوں کے سوکھے ٹنڈ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بالکل نیا مضمون ہے۔ یہی ندرت فکر و بیان ہے یہی بڑی شاعری کی پہچان ہے۔ آج کل کی تکمیل کردہ کتابی یا ڈیجیٹل شاعری جس میں الفاظ اور معنی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے ایک جدید بحرانی کیفیت کا حامل ہے جس کی اصل وجہ شعری ذوق کا فقدان ہے۔ ایک کامیاب شاعر اپنے تجربات کو سننے والے کے تجربات سے جوڑ کر اس کا اثر دوآتشہ کر دیتا ہے:

ع: میں نے یہ جانا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں

بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ

جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے

گلزار یہاں لفظ و معنی سے گزر کر محاسن شعری سے دوری کو خود دیکھتے ہیں اور ہمیں دکھاتے ہیں۔ روایتی قدیم میخانوں کے اطراف و اکناف میں آج بھی مٹی کے ٹوٹے پھوٹے پیالے جنھیں پھینک کر شیشے کے بلوری ساغروں میں شراب دینے کا طریقہ رواج پا چکا ہے یہ جدیدیت کا اثر ہے اگر چہ میخار جانتے ہیں سفالی سبو میں پینے کا مزا اور ہے ورنہ حضرت غالبؔ نہ کہتے: جامِ جم سے یہ میرا جامِ سفال اچھا ہے۔

اصطلاحات تلمیحات شعری خزانوں کی کنجیاں ہیں لیکن آگاہی اور علم نہ ہونے کی وجہ سے یہ چمنستان چیستان میں تبدیل ہو چکا ہے اور اسے شاعری میں ترک کر دیا گیا ہے جیسے سفالی سبو اب متروک ہو چکے ہیں۔

بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا

شاعر ہر قدم پر سننے والے کو اپنے تجربے میں شامل کر رہا ہے۔ وہ اسے اُن معمولی اور چھوٹے چھوٹے جزئیات میں شریک کرتا ہے جسے اُس نے لاشعوری طور پر کیا لیکن اب اس کا ذائقہ محسوس کر رہا ہے جو کمپیوٹر پر انگلی سے کلک کرنے پر نہیں ہوتا اگر چہ یہاں صفحات لاتعداد کھلتے چلے جاتے ہیں۔

زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گزرتی ہے

بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردہ پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے

انسانی ذہن مشق آموز ہے۔ وہ وہی کرے گا جس کی اُسے تعلیم دی گئی ہے۔ جس شخص نے کتابی مطالعہ کیا ہے وہ کمپیوٹر کے صفحہ پر اُسی کتاب کو ذوق وشوق سے نہیں پڑھ سکتا۔ عادت بدلنے کے لیے عمر کافی نہیں۔ چنانچہ کتاب کا صفحہ پلٹتے ہوئے ذہنی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پرانی کتابوں میں صفحات کے نیچے اُس لفظ کو لکھتے تھے جس سے آگے کا صفحہ شروع ہوتا تھا۔ جس کی ایک وجہ تو آئندہ صفحہ کا تعین تھا مگر اس سے زیادہ ذہنی موضوع اور خیال وفکر کا تسلسل تھا تاکہ اس میں فاصلہ نہ ہو۔ چونکہ ذہن الکٹرونک موجوں کا کرشمہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کتابی صفحہ ذہن میں موضوع کو متلاشی ہونے نہیں دیتا اور اسی کی طرف اس فکری نشہ کا اشارہ ہے جسے گلزار نے ذائقہ نام دیا ہے۔

یہاں تک گلزار نے کتاب کی معنوی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اب نظم کا وہ حصّہ ہے جس سے عوامی تعلق اور نظم کی شہرت کا تعلق ہے۔ یہاں شاعر نے کتاب کی صوری کیفیت اس کے جمال قدوخال اندرونی حال سے زعفران بکھیری ہے۔ چنانچہ اس حصّے میں رنگارنگی کے ہمراہ پھولوں کی نرمی کے ساتھ ساتھ محبت کی خوشبو بھی شامل ہے جس سے ہر فکر عطرِ نظم سے معطّر ہو جاتی ہے۔

ایک عمدہ شاعر جب منظر کشی میں سہ بُعدی Three dimensional حالت پیدا کرتا ہے تو وہ مرقع کشی ہو جاتی ہے۔ منظر سے منظر کو جوڑ کر یہاں مضمون کو رفعت دے کر عقیدتی بلندی پر گلزار نے کتاب کو رحیل پر نیم سجدہ حالت میں پڑھا کر آسمانی صحیفہ کر دیا جو کتاب کی معراج ہے۔

کبھی سینے پر رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے چھوتے تھے جبیں سے

ان مصرعوں میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی جھلک بھی ہے۔ یہاں معشوق کے خدو خال اور معبود کے کلام و جلال کی نسبت سے سینے پر رکھ کر گودی میں لے کر اور رحیل کی صورت یا نیم سجدے کی حالت میں گفتگو ہے۔ یہ ہمارا معاشرتی نظام کی تہذیب ہے جس کو سومناتی خیال کہتے ہیں۔ اس تہذیب اور تربیت کا کسی خصوصی مذہب اور دھرم سے تعلق نہیں بلکہ یہ برصغیر کے کلچر اور ہزاروں سال سے پیوستہ پنڈتوں کے حیات و ممات کے فلسفہ سے مربوط ہے۔ جس کا ذکر امیر خسروؒ، کبیر داس، بیدلؔ، غالبؔ اور بیدیؔ کے پاس بھی ہے۔

اس نظم کا آخری حصّہ دلکشی کا محور ہے۔ یہاں نظم رومانی دائروں میں گھومتی ہے۔ شاعر یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی۔

یہ سچ ہے کہ گذشتہ بیس (۲۰) سالوں میں کمپیوٹر نے اتنا علم ذخیرہ کیا ہے جو دنیا نے کبھی ایک جگہ جمع نہیں کیا تھا چنانچہ علم کے پیاسے کو علم کا سمندر تو ملے گا۔

مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
مہکے ہوئے رقّعے
کتابیں مانگنے گرنے اٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا

کبھی سینے پر رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے چھوتے تھے جبیں سے

ان مصرعوں میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی جھلک بھی ہے۔ یہاں معشوق کے خدوخال اور معبود کے کلام وجلال کی نسبت سے سینے پر رکھ کر گودی میں لے کر اور رحیل کی صورت یا نیم سجدے کی حالت میں گفتگو ہے۔ یہ ہمارا معاشرتی نظام کی تہذیب ہے جس کو سومناتی خیال کہتے ہیں۔ اس تہذیب اور تربیت کا کسی خصوصی مذہب اور دھرم سے تعلق نہیں بلکہ یہ برصغیر کے کلچر اور ہزاروں سال سے پیوستہ پنڈتوں کے حیات وممات کے فلسفہ سے مربوط ہے۔ جس کا ذکر امیر خسروؒ، کبیر داس، بیدلؔ، غالبؔ اور بیدیؔ کے پاس بھی ہے۔

اس نظم کا آخری حصّہ دلکشی کا محور ہے۔ یہاں نظم رومانی دائروں میں گھومتی ہے۔ شاعر یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی۔

یہ سچ ہے کہ گذشتہ بیس (۲۰) سالوں میں کمپیوٹر نے اتنا علم ذخیرہ کیا ہے جو دنیا نے کبھی ایک جگہ جمع نہیں کیا تھا چنانچہ علم کے پیاسے کو علم کا سمندر تو ملے گا۔

مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
مہکے ہوئے رقّعے
کتابیں مانگنے گرنے اٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا

وہ شاداب نہیں ہوں گے

یعنی کتابی متن تو کمپیوٹر اور موجوں میں آ جائے گا لیکن کتابی خدو خال سے وابستہ حسن و عشق کے معاملات، ملاقات، تبرکات، یادداشت، واقعات وغیرہ کبھی بھی سحر بن کر ہماری اُفق پر ظاہر نہ ہوں گے۔ نظم کے متن پر تفصیلی تبصرہ کرنے کے بعد ہم اس نظم کے اہم شعری ادبی نکات پر روشنی ڈالیں گے۔ گلزار کی نظم کے سرسری اور دقیق مطالعے سے جو شعری ادبی فنّی قدریں ہمیں نظر آتی ہیں اُن میں سے چند کا ذکر ضروری ہے۔

ا۔ ''کتابیں'' اُردو نظم ہے لیکن ہندوستانی عام فہم زبان میں لکھّی گئی ہے۔ حالؔی کی ''مناجات بیوہ'' سُن کر جب گاندھی جی رو پڑے تو مولوی عبدالحق نے کہا تھا اس سے عامی اور عالم دونوں متاثر ہیں۔ یہ نظم ہندوستانی زبان میں لکھّی گئی ہے۔ چنانچہ ''کتابیں'' بھی اردو رسم الخط نستعلیق میں ہو یا ہندی دیوناگری یا انگریزی رومن حروف میں لکھّی جائے نظم کے بیان بہاؤ اور اثر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسے صفائی، سادگی اور سلاست کہہ سکتے ہیں جو ماحول اور مکان کے تحت اچھا شاعر اپناتا ہے۔

ب۔ پوری نظم میں ایک بھی اضافت یا ترکیب نظر نہیں آتی۔ اگر چہ عربی اور فارسی کے اردو میں مستعملہ الفاظ جیسے صحبت، الفاظ، معنی، اصطلاحیں، تہہ، علم، رحیل، سجدے، جبین، رقعے، رشتے وغیرہ وغیرہ مصرعوں میں نگینوں کی طرح جُڑ دیے گئے ہیں۔ مصرعوں میں ان الفاظ کا کوئی حرف تلفظ میں ادھ بیان یا دب نہیں گیا۔ شاعری میں یہ استطاعت کہنہ مشقی اور شعر کی نوک و پلک

سنوارنے کی ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ میر انیسؔ کے نواسے میر مانوسؔ نے مسعود حسن ادیبؔ سے گفتگو میں کہا تھا کہ یہ افواہ غلط ہے کہ انیسؔ چادر تان کر نیم نیند کی حالت میں شعر کہتے تھے بلکہ تمام رات کنول جلا کر محنت و ریاضت سے اشعار کی نوک و پلک سنوارتے یعنی سیروں خون خشک کرتے جب جا کر ایک آبدار شعر ظاہر ہوتا۔ ''کتابیں'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلزار نے نظم کے مزاج لہجہ بناؤ سنگار پر اپنی فطری شاعری کی ثروت کے ساتھ فنی رکھ رکھاؤ پر وقت صرف کیا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے شہکار عرق ریزی، دیدہ وری اور پُرکاری سے وجود میں آتا ہے۔

ج: ''کتابیں'' آزاد نظم کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ اس کو مزید مغربی نیو ورس New Verse سے جوڑ سکتے ہیں جو آج کل برصغیر کی مختلف زبانوں کی شاعری میں رواج پا رہی ہے۔ یہاں عموماً زبان کتابی نہیں بلکہ تکلّمی رہتی ہے۔ یعنی نظم میں طرز بیان مصنوعی اور بناوٹی نہیں بلکہ اصلی اور فطری ہوتا ہے۔ جہاں تک بحر کے بہاؤ کا تعلق ہے مصرعوں کی بندش اُسی طرح ہوگی جیسے بات کرنے کا انداز یعنی جہاں رُکنا ہو، رُکیں۔ جہاں زور دینا ہے وہاں زور دیں، جہاں گفتگو کو ایک لہجے میں بیان کرنا ہو بیان کریں۔ چنانچہ مصرعوں کی لمبائی تکلّمی (Speech Rythm) آہنگ پر منحصر ہوتی ہے اسی لیے ''کتابیں'' میں بعض مصرعے تین لفظی اور بعض دس گیارہ لفظوں سے بنے ہیں۔

اس نیو ورس اور تکلّمی آہنگ کی وجہ سے نظم کی ترسیل اور تفہیم میں بڑی مدد ملی ہے۔ چنانچہ جب گلزار اس نظم کو پڑھتے ہیں تو مصرعوں کے اُتار چڑھاؤ، لہجے کے زیر و

بم سے اس کے اثر کو دو آتشہ کر دیتے ہیں۔

یہ نظم ایک اچھی مثال ہے اُردو آزاد نظم میں نیو ورس کی قدروں کو اپنانے کی اسے مابعد جدیدیت کے بعد کی عصری شاعری کا نمونہ سمجھا جائے۔

د: مصرعے فقرے بلکہ نظم روز مرہ میں ہے۔ الفاظ کی نشست اسی طرح کی ہے جیسے ہم بولتے ہیں جو نظم کا حُسن اور کمال بھی ہے۔

ھ: نظم میں ہندی کے رسیلے شبدوں کے علاوہ انگریزی کے مروجّہ الفاظ برتے گئے ہیں جو اکیسویں صدی اور گلوبل ولیج کی موجودہ شاعری کی پہچان بھی ہے۔ برصغیر کا مختلف زبانوں کا ماحول، انگریزی زبان کی ملکوں اور ٹکنالوجی پر دست اندازی اور تاثیر اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان انگریزی یا خارجی الفاظ کا متبادل لفظ جو فارسی یا عربی لوگ کر لیتے ہیں ہم بھی کر سکے۔ اس لیے ہم اسے اپنی زبان میں مستعملہ لفظ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سے نظم کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی جیسے:

کمپیوٹر کے پردوں پر
انگلی کلک کرنے سے
گلاسوں نے انھیں

یہی نہیں بلکہ اگر کوئی ادق اور غیر مانوس انگریزی لفظ بھی آ جائے تو اسے لفظوں کی نشست سے مانوس بنا لیتے ہیں جیسے

کہ جن کے (Cell) کبھی مرتے نہیں تھے۔

گلزار کے اس تجربے سے دنیا کی زبانوں کے سائنٹفک مطالب آسانی سے

اردو نظم ونثر ہو سکتے ہیں۔

و: اس نظم کے چند محاسن زبان و بیان اور صنائع لفظی و معنوی کو یہاں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

1. نظم میں سادگی شگفتگی روانی اور صفائی موجود ہے جو عموماً روزمرہ کی وجہ سے ہے۔
2. نظم میں بعض مطالب منظر کشی کے ہیں جو مرقع کشی بن چکی ہیں۔
3. محاورے حسب ضرورت اپنے صحیح مقام اور صحت کے ساتھ ہیں۔

جیسے حسرت سے تکنا

نیند میں چلنا وغیرہ

4. زود فہم تشبیہات اور استعارات:

— جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں (سکوروں کی طرح)

— کبھی گھٹنوں کو اپنے رحیل کی صورت بنا کر (رحیل کی صورت)

— بنا پتّوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ (سوکھے ٹنڈ)

— گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا (گلاسوں)

5. صنعت تعلیل: شاعر ایک عام کیفیت کو دوسرے معانی میں پیش کرتا ہے جیسے پتنگا جو شمع کے شعلے سے جل جاتا ہے وہ ایک حادثہ اور غفلت ہے مگر شاعر اُسے عشق قربانی اور پیار بتاتا ہے اور لوگ شاعر کے خیال کو مان لیتے ہیں۔

— کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے (زندہ شے دیکھ سکتی

ہے)

— حسرت سے تکتی ہیں (زندہ شے جذبہ حسرت رکھتی ہے)

زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا

(انگلی کو تھوک لگانا ذائقہ کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک صفحہ

اٹھانے کے لیے ہے)

6. صنعت مراعات النظیر : ایک ہی کیفیت، حالت، موضوع، مطالب کے الفاظ شعر میں لانا۔ جیسے: لفظوں، معنی، اصطلاحیں، متروک وغیرہ

پتّوں۔ سوکھے۔ ٹنڈ۔ اُگتے

— انگلی۔ سینے۔ گودی۔ گھٹنوں۔ جبیں

— پھول، سوکھے۔ مہکے وغیرہ

7. صنعت تکرار: الفاظ کی مصرعوں میں تکرار

— ادھڑے ادھڑے

— تہہ بہ تہہ

یہی نہیں بلکہ صنعت تجنیس، ابداع، تضاد وغیرہ کی مثالیں اس نظم میں موجود ہیں۔ بعض ایسی بھی صنعتیں نظر آتی ہیں جن کے نام نہیں۔ کیا ہم نے جنگل میں اگنے والے ہر پھول کو نام دیا ہے۔ شاید آئندہ وقت ان صنعتوں کو بھی نامی گرامی کرے گا۔

ز: ایسی نظموں کو تدریسی نصاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ گلدستہ کی طرح ان میں کلاسک موضوعات کے علاوہ ترقی پسند عناصر، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور عصری حسیّت کی جھلکیاں موجود ہیں جو زبان کے تحفظ اور ارتقا میں ضروری

ہیں ۔ ہم نے مضمون کی طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نظم میں شامل
علامات اشارات اور پیکر تراشی کے نمونے یہاں بیان نہیں کیے۔

ح: انسانی ذہن کی کیفیات شعور(Consious) تحت شعور(SubConsious) اور
لاشعور(Un Consious) کے تحت ہیں۔شعر کی تخلیق کا مبدا لاشعور ہے جسے
ہم درک نہیں کر سکتے جیسے کائنات کے بلاک مواد (Black Matter) کو ہم
نہیں دیکھ سکتے۔ اِسے شعری زبان میں الہام کہتے ہیں لاشعور سے خیال
جب تحت شعور کی فضا میں آتا ہے تو الفاظ کا جسم پہن کر آتا ہے کیونکہ تحت شعور
اور شعور میں جسم کا ہونا ادراک کے لیے لازمی ہے۔ جب خیال کا پرندہ لفظوں
کا جسم پہن کر ذہن کی فضا میں اُڑتا ہے تو فوراً شاعر اُسے صحیح اور موزوں کر کے
قرطاس کے قفس میں ہمیشہ کے لیے قید کر لیتا ہے جس کو ہم شعر کہتے ہیں پھر
اس کی شعور کی مدد سے نوک و پلک سنوارتا ہے۔ آمد اور آورد میں فرق یہی ہے
کہ آمد کے آسمان پر خیالات کے نادر جھنڈ لہراتے رہتے ہیں جو مبدائے
قدرت نے انھیں لاشعور میں بھر دیے ہیں۔ چنانچہ فطری شاعری اچھے اشعار
اور انتخاب در انتخاب کر کے شعر پیش کرتا ہے۔ راقم نے گلزار کی شاعری کا
تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور یقیناً وہ اس سعادت سے فیض یاب معلوم ہوتے
ہیں۔ اس لیے انھیں چاہیے قلم ہاتھ میں رہے اور سینوں اور دماغوں کے
صندوقوں میں بند خیالات یہیں اُگل دیں۔ ہم جانتے وہ بہت مصروف
شخصیت ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے فلم انڈسٹری کی یاد بود کتنے عرصے تک
رہے گی مگر یہ مجھے معلوم ہے وہ اپنی شاعری کی وجہ سے زندۂ جاوید رہیں گے۔

☆ تجزیہ سے حاصل ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ شاعر کو اپنے دور کے ماحول اور قاری، سامع کے معیار کو دیکھ کر شاعری کرنا چاہیے یا اُسے کسی بھی عنوان پر اپنی فکری بلندی، تجربہ اور علمیت سے حاصل ہوئی عظمت کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری نظر میں ایسے ہی شعرا آج بھی صدیاں گزرنے پر زندہ ہیں جنھوں نے تحسین نا آفرین کی خاطر اپنی آفرینی شاعری کو قربان نہیں کیا۔ شاعر کو چاہیے کہ تمام نادر مشکل فہم مضامین بھی جو اُس کی گرفت میں آسکے سادے یا مشکل ادق الفاظ میں باندھے اور جو موقع پر سنانا ہے سنائے۔ اس طرح ''چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد'' ہم نے بعض ویڈیوز میں دیکھا ہے گلزارؔ ان مصرعوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جو ماحول کی مناسبت اور سامعین کی موجودگی کے باعث ٹھیک عمل ہے۔ اصطلاحیں اور متروک الفاظ آج کے سب سامعین سمجھ نہیں سکتے۔

بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر دیا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید اور تشریح سے صاحب تصنیف اور ادب کو بھی فائدہ پہنچا ہے جس طرح صاحب تجزیہ اور قاری و سامع اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو حافظؔ نے ان لوگوں کو سراہا تھا جنھوں نے اُس پر تنقید کی تھی کہ ان کی وجہ سے میں سیدھے راستے پر گامزن ہوں۔ ہزار سال پرانے عربی شاعر ابونواس کا ذکر تجزیہ کے ذیل میں بے سود نہیں۔ ابونواس بغداد کی گلیوں سے گزر رہا تھا اُس نے

ایک مکتب کے معلّم کی آواز سنی جو شاگردوں سے پوچھ رہا تھا اچھا یہ بتاؤ ابونواس نے کیوں کہا۔(ترجمہ) اے ساقی شراب پلا اور یہ کہہ کر پلا کہ شراب ہے۔ یہاں شاعر کیوں کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ کر پلا کہ شراب ہے۔ابونواس چھپ کر سنتا رہا۔شاگردوں نے باری باری سے جواب دیا پھر معلّم نے کہا کہ بات یہ ہے جب ساغر شراب اس کے ہاتھ سے لمس ہوگا تو قوت حسیّہ سے اُسے سرور ہوگا۔ جب ساغر شراب اس کی نظروں سے ٹکرائے گا تو قوت باصرہ سے اس کو نشہ چڑھے گا۔ جب ساغر شراب اس کی ناک کے قریب آئے گا تو قوت شامّہ سے ترنگ حاصل ہوگا جب شراب کا قطرہ زبان پر پڑے گا تو قوت ذائقہ سے وہ مست ہوجائے گا۔اب صرف ایک حواس سننے کا شامل نہ تھا۔ چنانچہ جب شراب کا نام سنے گا تو اس کا نشہ دوآتشہ ہوجائے گا۔ یہ سن کر ابونواس دوڑا ہوا معلّم کے پاس آیا اور اسے گلے لگا کر کہا کہ ''بخدا شعر کہتے ہوئے میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا میں نے تو فقط یوں ہی کہہ دیا۔اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے شعرفہمی بعض اوقات شعرگوئی سے مشکل ہوتی ہے۔

جب ناقد تفصیل سے کسی کی تشریح ، تجزیہ اور تحلیل کرتا ہے تو صاحب تصنیف یعنی شاعر کے لیے نئے فکری زاویے قائم ہوتے ہیں اسی لیے تنقید بھی تخلیقی ادب میں شمار کی جاتی ہے۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ راقم نے گلزؔار صاحب کا تقریباً تمام مطبوعہ کلام پڑھا ہے۔بعض اشعار پر تنقیدی تشریحی اور تحلیلی حاشیے کتابوں میں لکھّے ہیں۔مغرب کی مشینی زندگی پھر ایک انارسو بیمار کی حکایت نے ابھی وہ موقع فراہم نہیں کیا جو ہم ایسے عمدہ شاعر کا مکمل تنقیدی اور تشریحی جائزہ لے سکیں ۔اگرچہ گلزار پر کئی تشریحی اور

تنقیدی مضامین چھپ چکے ہیں لیکن پھر بھی یہ ایک بڑا قرض ہے جو اردو کے ناقدین اور شارحین کو چکانا چاہیے۔ شاید اس کی قسط جلد میں خود ادا کروں۔ ادب کی دھنک میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس لیے اس کا حُسن اختلاف کے رنگ سے بھی بنا ہے۔ چنانچہ ہماری تحریر اگر چہ مستند حوالوں سے بنی اور بُنی گئی ہے مگر اس میں نظری اختلاف کی گنجائش ہے۔ توقع ہے کہ گلزؔار اسی طرح مسلسل تخلیقی جواہر معدن فکر سے بازارِ سخن میں پیش کرتے رہیں۔ یہ سچ ہے جس کا اشارہ فیضؔ نے کیا تھا۔

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گُہر جائیں گی

''کتابیں'' بتاتی ہے افسردگی کی ضرورت نہیں۔ اب صرف بازاروں میں نہیں بلکہ میلوں، کالجوں اور پردیس کے شہروں میں بھی جوہریوں نے دکان کھول رکھی ہے۔

☆☆☆